اسلامی معیشت
کے
چند نمایاں پہلو
محمد محترم فہیم عثمانی
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور

اسلامی معیشت
کے
چند نمایاں پہلو

محمد محترم فہیم عثمانی
(ایم۔اے، علومِ اسلامیہ۔ ایم۔اے، عربی)

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

طابع : اخلاق حسین، ڈائرکٹر

ناشر : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مطبع : محب وطن پرنٹرز لاہور

اشاعت :-

پہلی	مارچ ۱۹۷۵ء	۱۰۰۰

قیمت :- ۹-۰۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

عرضِ ناشر

دورِ حاضر میں معاشی علوم کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ دوسرے علوم کو کم ہی نصیب ہوئی ہے۔ اس ہی سلسلہ میں بعض گوشوں سے یہ آواز بھی بلند کی گئی کہ اسلام کا اپنا کوئی "معاشی نظام" نہیں۔ اس 'غلط فہمی' یا شرارت کو دُور کرنے کے لیے معاصر علماءِ اسلام نے اسلام کی معاشی تعلیمات کو روشناس کرانے اور ان کی برتری ثابت کرنے کے لیے کئی بیش قیمت کتب تالیف کیں۔ چنانچہ خود ہم نے اس اہم موضوع پر معاشیاتِ اسلام، سُود، اسلام میں عدلِ اجتماعی، اسلام کا نظریۂ ملکیت، غیر سودی بنکاری وغیرہ جیسی بلند پایہ کتب شائع کیں اور اسلام کے معاشی نظام کے خلاف اس غوغا آرائی کا بڑی حد تک سدِّباب ہو گیا۔

ان سب کے باوجود اسلامی نظامِ معیشت کے بعض گوشے ایسے باقی تھے جن کو اُجاگر کرنے کے لیے اہلِ علم کی مزید کاوشوں کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے عزیز دوست محمد محترم فہیم عثمانی صاحب نے قلم سنبھالا اور اسلام کی معاشی تعلیمات کے ان پہلوؤں کی مدلّل و مفصل تشریح و توضیح کی جو یا تو ابھی تک تشنہ تھے یا جن کی طرف دیگر اصحابِ علم نے کم توجہ کی تھی۔

یہ گراں قدر کاوشیں اب تک مختلف رسائل کے صفحات میں منتشر تھیں اور

عام طور پر ان سے استفادہ کرنا ممکن نہ تھا۔ بحمداللہ اب یہ مضامین نظرثانی کے بعد ایک مجلد میں پیش کیے جا رہے ہیں، اس سے نہ صرف اِن سے استفادہ آسان ہو گیا بلکہ اِن کی افادیت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی۔

اس مجموعہ میں آپ کو جدید معاشی مسائل کا اسلام کی روشنی میں بصیرت افروز تجزیہ ملے گا، مختلف معاشی مسائل کا اسلامی تعلیمات کے مطابق حل ملے گا اور موجودہ معاشی نظاموں نے ہماری معاشرت میں جو خرابیاں پیدا کر دی ہیں، ان کا علاج ملے گا۔ ہمیں امید ہے کہ جو حضرات معاشی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اور خصوصاً معاشیات میں اسلامی نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہتے ہیں، وہ اِس کتاب کو نہایت کارآمد اور مفید پائیں گے۔

۱۷ صفر ۱۳۹۵ھ

لاہور۔ مطابق یکم مارچ ۱۹۷۵ء

نیازمند

اخلاق حسین

فہرست مضامین

انفرادی ملکیّت پر اسلام کی عائد کردہ حدود و قیود فسادِ سرمایہ داری کا بہترین علاج ہیں

نظامِ سرمایہ داری کے نتیجے میں انسانی معیشت جس فساد کا شکار ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ جاگیر دارانہ نظام کی اصلاح کی خاطر جس نظامِ معاش کو انسان کی محدود عقل نے اپنی نجات کا راستہ سمجھا تھا وہ مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ اب اس کی ایک ایک خامی پوری طرح کھل کر دنیا کی نگاہوں کے سامنے آچکی ہے۔ بے لگام انفرادی ملکیت کی کھُلی آزادی اور ارتقائے معیشت کے فطری اسباب پر بے جا اعتماد نے معیشتِ انسانی کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے قید معیشت کے مبالغہ آمیز اصولوں نے انسان کو تباہی کے غار پر لا کھڑا کیا ہے اور انسان اک بار پھر نجات کی کسی نئی راہ کی تلاش میں ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ اس بار پھر اسی غلطی کا اعادہ کرنے لگا ہے جو نظامِ جاگیر داری سے پیچھا چھڑانے کے سلسلہ میں وہ اُس سے پہلے کر چکا ہے۔ وہ اک بار پھر اپنی محدود اور ناقص عقل پر اعتماد کر کے ایک ایسے نظام کو تجربہ کی سان پر چڑھانے لگا ہے جس کا نقص اور جس کے مضر نتائج ابتداء ہی سے روزِ روشن

کی طرح واضح ہیں۔ دراصل جو نظام فساد سرمایہ داری کی اصل وجہ ہی نہ پہچان سکے وہ اس کی اصلاح کیا کرے گا۔ اشتراکی معاشی نظام نے بنیادی ٹھوکر ہی یہی کھائی ہے کہ وہ سرمایہ داری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اصل بیماری کی صحیح تشخیص ہی نہیں کر سکا، یہی وجہ ہے کہ غلط تجویز کی راہ پر پڑ گیا۔ اشتراکیت نے سرمایہ داری کی تمام خرابیوں کی اصل جڑ انفرادی ملکیت کے جواز کو قرار دیا۔ چنانچہ اس نے اپنے فلسفۂ معیشت کی بنیاد انفرادی ملکیت کے ابطال پر رکھی اور اس بات کو سرے سے نظر انداز کر دیا کہ انفرادی ملکیت کا ابطال فطرت انسانی کے تقاضوں کی عین ضد ہے۔ انفرادی ملکیت کا جواز تو وہ بنیاد ہے جس پر قدیم ترین زمانہ سے انسانی معیشت کی تعمیر ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ تو بنی نوع انسان کے ہر فرد کا وہ حق ہے جس کو تمام مذاہب، سارے فلسفہ ہائے حیات اور ہر زمانہ کے قوانین ابتدائے دنیا سے مسلّم مانتے چلے آئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سرمایہ داری کے فساد کے پیدا کرنے میں انفرادی ملکیت کے سرمایہ دارانہ تصوّر کا ایک حصّہ ضرور تھا مگر اس معنی یہ نہیں کہ محض اس کا جواز ہی خرابی کی اصل وجہ ہو جیسا کہ اشتراکیت نے سمجھا۔ بلکہ وہ اس معنی میں تھا کہ نظام سرمایہ داری میں انفرادی ملکیت کے حصول کے حق اور اس کو اپنے تصرف و استعمال میں لانے کے اختیار کے معاملہ میں افراد معاشرہ کو بالکل بے قید اور بے لگام چھوڑ دیا گیا تھا اور اس بات کا قطعًا کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا کہ انفرادی حقوق کا استعمال اجتماعی مفاد کے لیے مضر نہ ہونے پائے۔ اشتراکیت کی نظر اس حقیقت کی طرف نہ گئی، اس نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ہی فساد کی جڑ سے تعبیر کیا اور اس کو مٹانے کے درپے ہو گئی کہ نہ رہے بانس

اور نہ بجے بانسری۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ اس کا نتیجہ بنی نوع انسان کے حق میں پہلے سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوا جس حقیقت کی طرف انسان کی محدود و ناقص عقل راہ نہ پا سکی انسان کے پیدا کرنے والے کی نظر سے پوشیدہ نہ تھی۔ اسلام جو خالق کائنات کا بھیجا ہوا دین ہے انسانی معیشت کے تمام پہلوؤں سے کما حقہ واقف تھا اُسے معلوم تھا کہ انفرادی اور اجتماعی حیثیتیں انسانی زندگی کے دو مختلف پہلو ہیں جن کا باہم مربوط رہنا انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے انفرادی ملکیت کے حق کو بدستور برقرار رکھا لیکن اس کو ایسی حدود و قیود کا پابند بنا دیا کہ ان کے ذریعے سے اجتماعی مفاد کا تحفظ بھی بدرجہ اتم حاصل رہا۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کے حصول کو بھی جائز و ناجائز کی تفریق کا پابند بنا دیا اور اس پر انسانی تصرف و استعمال کے حق کو بھی محدود اور مقید کر دیا۔ اور اس طرح ان تمام خرابیوں کا ابتدا ہی سے سدِ باب کر دیا جن سے سرمایہ داری کے مطلق و غیر محدود تصور ملکیت کے نتیجے میں آج ہم دوچار ہیں۔ زیر نظر تحریر میں اسی بات کا جائزہ لینا ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق پر اسلام کی عائد کردہ حدود و قیود سرمایہ دارانہ نظام کی تمام خرابیوں کا کس طرح مکمل طور پر اور ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیتی ہیں۔

فسادِ سرمایہ داری کی اصل بنیاد

سرمایہ داری کی تمام تر خرابیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے انفرادی ملکیت اور اس کے حصول کی کوششوں کے سلسلہ میں اچھے اور برے کی کوئی تمیز نہیں رکھی۔ اس نے شخصی آزادی کا ایک مبالغہ آمیز تصور اختیار کرتے ہوئے قطعاً اس بات کا خیال نہ رکھا کہ اس آزادی فرد کے نتیجے میں اجتماع کا مفاد مجروح نہ ہو اس نے افراد کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ جس طرح چاہیں دولت کمائیں اور اُسکے جائز مالک بن جائیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرمایہ دار اپنے بدنام

مفہوم میں سرمایہ دار بنتا ہی ناجائز ذرائع سے ہے۔ اگر آج سود کا کاروبار بند کر دیا جائے، اتلاف مال کو ممنوع ٹھہرا دیا جائے، غائب سودے اور تجارتی قمار بازی کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ (Trade Cycle) (کاروبار کا چکر) کے نام پر جو مصنوعی کساد بازاری ہر سال ارادتاً پیدا کی جاتی ہے اس کی قانونی طور پر روک تھام کی جائے۔ اسی طرح دولت کمانے کے دیگر وہ تمام ذرائع جو اجتماعی مفاد کے لیے نقصان دہ ہیں حکماً مسدود کر دیئے جائیں تو ہزار کوششوں کے باوجود کوئی ایک شخص بھی اس قدر دولت مند نہیں ہو سکتا کہ اس پر سرمایہ دا. کے مفہوم کا اطلاق ہو سکے۔ اسلام نے سرمایہ داری کی اس بنیادی خرابی کا پہلے ہی مرحلہ میں علاج کیا۔ اس نے ملکیت کے حصول کی کوششوں میں جائز و ناجائز کی تفریق رکھی۔ اس نے افراد معاشرہ کو دولت کمانے کی کھلی چھٹی نہیں دے دی کہ جس طرح چاہیں کمائیں بلکہ اس نے اجتماعی مفاد کا لحاظ رکھتے ہوئے تمام وہ ملکیتیں درست قرار دیں جو شارع کی مقرر کردہ قیود کے اندر رہ کر حاصل کی گئی ہوں اور وہ تمام ملکیتیں ناجائز ٹھہرائیں جو ان قیود سے تجاوز کر کے تصرف میں لائی گئی ہوں۔

جائز و ناجائز ملکیت کے بنیادی اصول

اسلام نے اس سلسلہ میں جو بنیادی اصول متعین کیے ہیں وہ ہمیں قرآن حکیم کی اس آیت سے ملتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ

وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ط (سورۃ النسار آیت ۲۹، ۳۰)

" اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو اور اپنی جانیں کو قتل مت کرو "

اس آیت کی روشنی میں ملکیت اموال کے سلسلہ میں تین رہنما اصول سامنے آتے ہیں۔

اوّل :- یہ کہ ملکیت اموال کے حصول کے لیے تمام وہ طریقے ناجائز ہیں جن کو شریعت نے باطل ٹھہرایا ہے، جو خیانت اور بددیانتی پر مبنی ہوں اور جن میں ایک فرد کو فائدہ دوسرے فرد کے نقصان پر منحصر ہو۔

دوم :- تمام وہ ملکیتیں ناجائز اور غیر قانونی ہیں جو باہمی رضامندی کے بغیر تصرف میں لائی گئی ہوں۔

سوم :- حصول ملکیت کے وہ طریقے بھی باطل ہیں جو بالآخر تمہارے اپنے لیے موجب ہلاکت ہوں یا تمہارے ہم جنسوں کے لیے یعنی اجتماع کے لیے مضر ہوں۔

پہلا اصول لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کے الفاظ سے مستنبط ہوتا ہے۔ اس اصول کے تحت تمام وہ ملکیتیں آجاتی ہیں جو خیانت اور بددیانتی کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہوں، یا جو ایک فرد کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر مبنی ہوں۔ اس طرح چوری، رشوت، غبن، ناپ تول میں کمی اور دیگر تمام دھوکے اور فریب کے کاروبار کے ساتھ ساتھ اکتساب مال

کہ وہ تمام ذرائع بھی ممنوع قرار پائے جو سود، جوا، سٹہ اور احتکار وغیرہ کے تحت آتے ہیں۔

دوسرے اصول کے تحت حصول ملکیت کے تمام وہ ذرائع آجاتے ہیں جن میں فریقین کی باہمی رضامندی مفقود ہو۔ اس طرح اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ کے الفاظ نے تمام وہ طریقے باطل ٹھہرا دیئے جو دھوکے یا دباؤ پر مبنی ہوں۔ گویا اتلاف مال کے تمام طریقے، غائب سودوں کی ساری شکلیں، تجارتی قمار بازی کی کل صورتیں اور مصنوعی کساد بازاری کی تمام کوششوں کو اس آیت قرآنی نے ناجائز قرار دے دیا۔

تیسرے اصول نے جو لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کے الفاظ سے مترشح ہے حصول دولت کے تمام وہ وسائل بھی مسدود کر دیئے جن سے جھگڑے اور فساد کو راہ ملتی ہو، یا جو انسان کے اپنے لیے مضر اور مفاد عامہ کے خلاف ہوں۔ فحاشی پھیلانے والے کاروبار، قحبہ گری، شراب اور دوسرے مسکرات کی صنعت و تجارت، ضرر رساں اجارہ داریاں اور کسی معقول وجہ کے بغیر دولت اور اس کی پیدائش کے وسائل سے عام لوگوں کو کسی بھی طریقہ سے محروم کرنا سب اسی اصول کے تحت آتے ہیں۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ اسلام نے جن متذکرہ بالا ذرائع حصولِ ملکیت پر سخت قانونی بندشیں عائد کر دی ہیں، کیا یہی وہ طریقے نہیں ہیں جن کے ذریعہ لوگ کروڑپتی اور ارب پتی بنتے ہیں۔ اسلام نے اکتساب مال کے جن وسائل کو جائز ٹھہرایا ہے ان کی حدود میں رہ کر کیا اشخاص کے لیے بے اندازہ دولت سمیٹتے چلے جانے کا کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے۔ حصول ملکیت کے ان ذرائع کو ممنوع ٹھہرا

کہ کیا اسلام نے سرمایہ داری کی تمام خرابیوں کا پہلے ہی مرحلہ میں صفایا نہیں کر دیا؟

تصرف و استعمال کی حدود و قیود

حصول ملکیت کے حق کو محدود و مقید کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے انفرادی ملکیت پر تصرف و استعمال کے حق کو بھی چند حدود و قیود کا پابند بنایا تاکہ ایسی صورت حال ہی پیدا نہ ہونے پائے کہ لوگ اکتساب مال کے ناجائز ذرائع کو اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پانے لگیں نیز سرمایہ دارانہ معاشرہ میں جو دیگر خرابیاں اس راہ سے جنم لیتی ہیں ان کا بھی انسداد ہو جائے۔ آیئے ذرا جائزہ لیں کہ ان حدود و قیود کے ذریعے سے اسلام سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی کن کن خرابیوں کا سدِ باب کرتا ہے۔

اتلافِ مال

نظامِ سرمایہ داری کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ تاجر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے جتنی تعداد میں چاہے اپنے اموال تجارت یا صنعتی و زرعی پیداوار کو بازار میں لانے کے بجائے ضائع کر دے، خواہ کروڑوں آدمی ان اشیاء کے ضرورت مند ہوں۔ جب تاجر یا صنعت کار یہ دیکھتا ہے کہ مال کے ایک حصّہ کو ضائع کر دینے سے بقیہ مال کی قیمت چڑھ جائے گی تو اس کی خود غرضی اسے اتلافِ مال پر آمادہ کر دیتی ہے اور سرمایہ دارانہ مطلق تصوّر ملکیت اس کو اس کی اجازت دیتا ہے مگر اسلام کی نظر میں مال و املاک کو جو انسانی زندگی کا سہارا ہیں ضائع کرنا پوری انسانیت کی حق تلفی اور اس پر ظلم کے مترادف ہے۔ قرآن کریم مال کے ضائع کر دینے کو فساد

سے تعبیر کرتا ہے اور فساد پیدا کرنے کو حرام قرار دیتا ہے۔

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (سورۃ بقرۃ آیت ۲۰۵)

"اور جب پیٹھ پھیر جاتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر فساد کرے اور کھیتی اور جانوروں کو تلف کرے دراں حالیکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی صراحت فرمائی ہے کہ مال کو ضائع کرنا ممنوع ہے۔

سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ كَرِهَ لَكُمْ ثَلَاثًا قِيلَ وَقَالَ وَإِضَاعَةَ الْمَالِ وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ۔

(بخاری کتاب الزکوٰۃ)

"(مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا) میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے تین چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے قیل وقال کرنا، مال ضائع کرنا اور کثرت سے سوال کرنا۔"

یہی مضمون صحیح مسلم کی ایک مفصل حدیث میں بھی آیا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"اضاعت مال سے مراد مال کو غیر شرعی طور پر صرف کرنا اور تلف بے جا کے حوالے کرنا ہے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ (معاشرہ میں) بگاڑ پیدا کرنے کے ہم معنی ہے۔" (نووی۔ شرح مسلم کتاب الاقضیہ)

دراصل انسان کو اللہ کی طرف سے اشیاء میں جو حق ملکیت عطا کیا گیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ وہ اسے اپنے مقاصد حیات کے حصول کا ذریعہ بنائے اور مال کو ضائع کرنا اس منشاء کے منافی ہے۔ اسلامی تصور ملکیت کے مطابق ملکیت فی الحقیقت مالکِ حقیقی کی امانت ہے اور امین کو امانت کے ضائع کر دینے کا کوئی حق نہیں۔

استحصال بے جا

سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریوں میں سے ایک بیماری سرمایہ دار کو استحصال بے جا کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ اس نظام میں سرمایہ دار کو بازار کی قوتوں پر غیر معمولی قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اشیاء کو گراں کر کے یا بے جا نفع اندوزی کے ذریعہ دوسروں کو استحصال کا نشانہ بناتا ہے۔ چونکہ اسے بازار پر پوری اجارہ داری حاصل ہوتی ہے اس لیے اپنی مرضی کے مطابق اشیاء کی قیمت لاگت سے بہت زیادہ وصول کرتا ہے، اشیاء کا معیار گرا دیتا ہے اور صرف نفع اندوزی کی خاطر سماجی ضرورت سے کم مقدار میں مال تیار کرتا ہے غرض اپنے نفع کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی فکر میں وہ دوسروں کی مضرت کی پرواہ کیے بغیر جو پالیسی چاہتا ہے اختیار کرتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام اس کی ان تمام پالیسیوں کو قانونی حفاظت بخشتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں فرد کو آزادی سعی کا پورا پورا حق حاصل ہے وہ اپنی پیداوار اور اشیاء کی تیاری کو جس قدر چاہے بڑھائے، جس قدر چاہے گھٹائے اپنے مال کی جو قیمت چاہے رکھے، جتنے آدمیوں سے جس اُجرت پر چاہے کام لے، اپنے کاروبار کے سلسلے میں جو پالیسی چاہے اختیار کرے،

حکومت یا ریاست کو اُن سارے معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ اس کے نزدیک معیشت کا یہ فطری عمل ہے جس میں کسی بھی قسم کی مداخلت معیشت کے توازن کو بگاڑنے کے ساتھ ساتھ انفرادی ملکیت کے حقوق پر دست اندازی کے مترادف ہے۔ مگر اسلام اس نقطۂ نظر کا سخت مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرد کو اپنی ملکیت اس طرح استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں جس سے دوسرے اشخاص یا بحیثیت مجموعی پورے معاشرہ کو نقصان اور ضرر پہنچے۔ صرف دانستہ نقصان پہنچانے ہی کا ذکر نہیں بلکہ وہ دوسروں کو مضرت رسانی کا ارادہ نہ بھی رکھتا ہو تو بھی اگر اس کے کسی مالکانہ تصرف سے دوسروں پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہوں تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اپنے تصرف میں اس طرح ترمیم کرے کہ دوسرے اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی مضرت رسانی سے اجتناب کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ -

(یحییٰ ابن آدم القرشی کتاب الخراج ص۹۴)

"اسلام میں مضرت رسانی کی کوئی گنجائش نہیں نہ ابتدا از نہ جوابی کارروائی کے طور پر"

ایک اور موقعہ پر آپ نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ ضَارَّ ضَارَّ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ شَاقَّ شَقَّ اللّٰهُ عَلَیْهِ -

(ترمذی باب ماجاء فی الخیانۃ والغش)

"جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے گا اس کو اللہ نقصان پہنچائے گا اور جو کسی دوسرے کو تکلیف دے گا اس کو اللہ تکلیف دے گا۔"

اسی عدم مضرت رسانی کے تحت اسلام اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ مال کو مہنگا کرنے کے لیے ذخیرہ اندوزی سے کام لیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں اس کی ممانعت فرمائی۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنِ احْتَكَرَ يُرِيْدُ أَنْ يَتَغَالَى بِهَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ فَهُوَ خَاطِئٌ وَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللهِ۔

(حاکم، مستدرک : جلد ۲ صفحہ ۲)

"جو مسلمانوں کے لیے نرخ گراں کرنے کی نیت سے ذخیرہ اندوزی کرے وہ غلط کار ہے اور اللہ اس سے بری ہے۔"

دراصل اسلام کی نظر میں ہر ایسی کوشش مذموم ہے جو بازار کے نرخ کے فطری عمل میں دخل دینے کے مترادف ہو اور جس کا مقصود اشیائے تجارت کو گراں کرنا ہو، خواہ وہ اشیاء کی رسد میں مصنوعی طور پر کمی کر کے حاصل کیا جائے یا کسی دوسرے طریقہ کے ذریعہ ہو۔ اس قسم کی دخل اندازی پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید وعید سنائی ہے۔ مسند ابوداؤد میں حضرت معقل بن یسار سے ایک روایت ہے آپ نے فرمایا۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ دَخَلَ فِيْ شَيْءٍ مِنْ إِسْعَارِ الْمُسْلِمِيْنَ لِيُغْلِيَهُ عَلَيْهِمْ كَانَ حَقًّا

عَلَى اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَنْ يَقْذِفَهٗ فِيْ مُعْظَمِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (مسند ابو داؤد الطیالسی :- ص۲۵ طبع حیدر آباد)

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کہ اُسے گراں کر دے تو اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن اُسے زبردست آگ میں جھونک دے۔"

اسی طرح خریدار کی شدّت احتیاج اور اس کی اضطراری کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اشیاء کو مہنگے داموں فروخت کرنے کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ فقہاء نے ایسے معاہدے کو بیع فاسد سے تعبیر کیا ہے۔ غرض اسلام ملکیت کے استعمال پر افراد کا ایسا کوئی حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں جس سے دوسرے افراد یا بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو نقصان اور ضرر پہنچے اور اس طرح اسلام معاشرہ میں ہر قسم کے استحصال بے جا کا دروازہ ہی بند کر دیتا ہے۔

بے جا صرف مال اور عیش کوشی

نظامِ سرمایہ داری میں چونکہ فرد کو اپنی ملکیت پر تصرف و استعمال کا بے قید حق حاصل ہے اس لیے ہر شخص کو کھلی چھٹی مِل جاتی ہے کہ وہ اپنے مال کو جس مصرف میں چاہے استعمال کرے اور اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہ کرے کہ اس کے کسی صرفِ مال سے معاشرہ پر کیا مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں یا اس کا کوئی بے جا اور فضول مصرف معاشرہ کے دیگر ضرورت مند افراد کے لیے روزی کے کتنے مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ وہ معاشرہ کے عام معاشی حالات سے بے نیاز اپنے

آرام و آسائش کے اہتمام کی فکر میں لگا رہتا ہے، محض اظہار ثروت اور دکھاوے کے لیے بے دریغ مال صرف کرتا ہے، اپنی ملکیت کو جوئے بازی اور حرام سٹہ بازی میں لگانے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا، شراب، زنا کاری اور دوسرے محرمات پر مال صرف کرنے میں بھی اُسے کوئی عار نہیں آتی اور سرمایہ دارانہ نظام ان تمام باتوں کو اس کا قانونی حق قرار دیتا ہے۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا جو اُسے بتلائے کہ اس کے اس قسم کے بے جا صرف مال سے معاشرہ میں انفرادی و اجتماعی حالات کا توازن بگڑ رہا ہے اور معاشرہ میں احساس محرومی، احساس کمتری، اخلاقی فساد اور حرص و ہوس کے امراض جڑ پکڑ رہے ہیں۔ اسلام ایسی صورتِ حال کا کسی طور روادار نہیں۔ وہ ملکیت پر فرد کے حق تصرف و استعمال کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ ایسی اغراض کے لیے استعمال نہ کیا جائے جنہیں شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام صرفِ مال اور استعمال ملکیت کو اس حد تک محدود بناتا ہے کہ وہ اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ جائز اغراض میں سے بھی اگر کسی غرض کی تکمیل مال کی ایک خاص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے تو اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدہ کے زائد مقدار مال صرف کیا جائے۔

تبذیر و اسراف

غیر شرعی مصارف پر مال صرف کرنے کو اسلام تبذیر سے تعبیر کرتا ہے اور اسے خدا کی نافرمانی کے ہم معنی ٹھہراتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ

(سورۃ الاسرا آیت ۔ ۲۵، ۲۶)

"اور مال کو فضولیات میں نہ اڑا بیشک فضولیات میں اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں۔"

شراب، زناکاری، جوا، سٹہ اور دوسرے محرمات شرعیہ پر صرفِ مال سب اسی تبذیر کے تحت آتا ہے۔ باطل افکار و خیالات کی اشاعت اور فحش باتوں کی تشہیر پر مال خرچ کرنا بھی تبذیر ہی میں داخل ہے۔ محض اظہار ثروت اور نمود و نمائش پر صرف مال بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ غرض وہ تمام اغراض جو بذاتِ خود ممنوع ہیں وہ تبذیر میں داخل ہیں اور ان پر صرف مال ممنوع ہے۔ تبذیر کے علاوہ جائز اغراض پر بھی ضرورت سے زیادہ صرفِ مال کو اسلام ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں ایسے صرف مال کو اسراف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں جابجا اسراف کی مذمت آئی ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ

(سورۃ اعراف آیت: ۳۱)

"کھاؤ اور پیو لیکن اسراف سے کام نہ لو بیشک وہ (اللہ) مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔"

مال صرف کرنے سے آدمی کا مقصود اپنی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے یا سہولت اور آرام و سکون کے حصول کی خاطر مال صرف کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں مال کا استعمال زینت و آرائش کے لیے بھی کیا جاتا ہے جس سے انسان کے ذوق جمال کو تسکین ملتی ہے۔ اسلام ان تینوں اغراض کو اسی حد تک جائز اور درست سمجھتا ہے جس حد تک ان میں اعتدال ملحوظ رہے اور جو فائدہ مطلوب ہے اس کے لیے

اتنا ہی مال صرف کیا جائے جتنا اس کے لیے کافی ہو۔ قرآن کہتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَ

کَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (سورۃ الفرقان آیت ۶۶)

"(اللہ کے بندے وہ ہیں) جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل

بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال کی روش اختیار کرتے ہیں"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَالْبَسُوْا وَتَصَدَّقُوْا مِنْ غَیْرِ اِسْرَافٍ

وَلَا مَخِیْلَةٍ۔ (بخاری کتاب اللباس باب اول)

"کھاؤ پیو پہنو اور صدقہ کرو مگر اس میں اسراف یا گھمنڈ نہ ہو"

دراصل اسلام کے نزدیک مال و دولت زندگی کو باقی رکھنے کا ایک ذریعہ ہیں مگر خود زندگی کے بھی کچھ مقاصد ہیں۔ اسلام فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قیام حیات کے ضروری اہتمام کے بعد اپنے مال و دولت کو ان بلند تر مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے نہ یہ کہ اسے عیش کوشی اور لذت اندوزی کی نذر کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لذاتِ دنیا میں انہماک اور مبالغہ کی حد تک آرام و سہولت کو ناپسندیدہ قرار دے کر اس سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ ارشاد ہے۔

اِیَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ۔

(مشکوٰۃ باب فضل الفقراء)

"خبردار عیش کوشی سے اجتناب کرو کیونکہ اللہ کے بندے عیش کوش نہیں ہوتے"

گردش دولت کی ناہمواری

سرمایہ دارانہ نظام کا پورا ڈھانچہ کچھ ایسی نہج پر کھڑا کیا گیا ہے کہ اس میں قدرتی طور پر دولت کی گردش ناہموار رہتی ہے۔ پورے سماج کی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی ہے اور دیگر افراد معاشرہ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سود اور بنکاری کا نظام سرمایہ دار میں دولت جمع کرنے اور اس پر سود وصول کر کے اُسے بڑھانے کی حرص کا مادہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ نتیجتاً دولت سمٹتی رہتی ہے، عوام کی قوتِ خرید گھٹتی چلی جاتی ہے، صنعت و تجارت کساد بازاری کا شکار ہونے لگتی ہے اور بالآخر پورا معاشرہ معاشی تباہی کے دہانے پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ تصور ملکیت کی رو سے سرمایہ دار کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اپنا سارا مال جمع کر چھوڑے ایک حبہ بھی خرچ نہ کرے خواہ اس کے اس عمل سے معاشرہ میں کیسی ہی معاشی بدحالی کیوں نہ پیدا ہو رہی ہو۔ اسلام گردش دولت کی اس ناہمواری کا شدت سے سدباب کرتا ہے۔ سود کی حرمت اور نظام زکوٰۃ کے نفاذ کے ذریعہ اس بات کا خاص انتظام کرتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے پورے معاشرہ میں گردش کرتی رہے۔ اسلام زائد از ضرورت دولت جمع کرنے کو معیوب قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ ط ۔ (آل عمران ۱۸۰)

"اور جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں گے کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے نہیں بلکہ ان کے حق میں بُرا ہے۔"

اسی طرح سورۃ توبہ میں ارشاد ہے :-

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ -

(توبہ : ۳۴)

"اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں۔ اور اسکو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی خبر دے دو۔"

اسلام دراصل فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ جو کچھ اسکی ملکیت میں ہے وہ یا تو اسے اپنی ضروریات پر صرف کرے یا دوسروں کو دیدے تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ اگر کسی کو جمع کرنے ہی کا شوق ہے تو اسے یہ تو حق ہے کہ وہ جمع کرے مگر اسلام اس سے از روئے قانون اسکی جمع سے ½۲ فیصد رقم ان لوگوں کی ضروریات کے لیے لے لیتا ہے جو معاشی طور پر محروم رہ گئے ہیں، اسی کا نام زکوٰۃ ہے۔ اس کے بعد بھی دولت اگر کسی شخص کے پاس سمٹی رہ گئی ہے تو اس کے مرنے کے بعد اسلام اپنے قانون وراثت کے ذریعہ اس دولت کو پھر متعدد ہاتھوں میں پہنچا دیتا ہے۔ غرض اسلام نے اپنے معاشی نظام کی پوری تعمیر ایسے انداز سے اٹھائی ہے کہ اس میں گردش دولت کی ناہمواری پیدا ہی نہیں ہونے پاتی اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کی ایک بڑی خرابی کا از خود علاج ہو جاتا ہے۔

اس پوری تفصیل کے بعد قارئین کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اسلام نے انفرادی ملکیت کے حق کو حدود و قیود کا پابند بنا کر کیسے احسن طریقے سے اجتماعی مفاد کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ افراد معاشرہ کی انفرادی و اجتماعی حیثیت کو کتنا باہم مربوط رکھا ہے اور اس طرح ان تمام خرابیوں کا ابتدا ہی میں مکمل سدِ باب کر دیا ہے جن سے آج ہم سرمایہ داری کے مطلق و غیر محدود تصور ملکیت کے نتیجے میں دوچار ہیں۔ فی الحقیقت نظام سرمایہ داری کے نتیجے میں انسانی معیشت جس فساد کا شکار ہے اس کی اصلاح کی واحد اور صحیح صورت یہی ہے جو اسلام نے اختیار کی ہے۔ اشتراکیت کو تو اس فساد کی اصلاح کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اشتراکیت نے انسانی معیشت کی اصلاح کا جو راستہ اختیار کیا ہے وہ اصلاح کے بجائے فسادِ مزید کی طرف لے جاتا ہے۔ دلائل اور تجربہ دونوں اس حقیقت کے شاہد ہیں۔
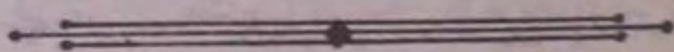
"تنعّم و عیش کوشی" اسلام کی نظر میں

تنعم و عیش کوشی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی ایسی اغراض کے لیے اپنا مال صرف کرے جن کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے مثلاً شراب، زناکاری اور دوسرے محرمات یا اپنے مال کو جوئے بازی، سٹہ بازی میں لگائے یا محض اظہارِ ثروت اور دکھاوے کے لیے مال خرچ کرے۔ یہ تمام اغراض چونکہ شریعت اسلامیہ نے بذاتِ خود ممنوع ٹھہرائی ہیں اس لیے ان اغراض کے لیے اپنا مال استعمال کرنا بھی ممنوع ہے۔ تنعم و عیش کوشی کی یہ صورت تو ظاہر ہے محرمات و ممنوعات کی صف میں آتی ہے۔ اور اسلام ان اغراض کے لیے مال کے استعمال کی کسی صورت میں اجازت نہیں دیتا قانونی طور پر ان کے سدِ باب کے لیے حدود و تعزیرات مقرر کرتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ تنعم و عیش کوشی کی اس صورت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے جو شرعی حدود سے تو متجاوز نہ ہو اور جس میں بہرہ اندوز صرف ایسی اغراض پر مال صرف کر کے ہوا جائے جو مباحات کے دائرہ میں آتی ہوں مگر ایسی تنعم و عیش کوشی کے نتیجے میں بھی معاشی ناہمواری جنم لیتی ہو اور قومی دولت کا ضیاع ہوتا ہو۔ شریعت اسلامیہ میں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک دولت مند کو اسلام نے ان مباحات سے لطف اندوز ہونے میں کسی حد کا پابند بھی کیا ہے یا نہیں کیا

وہ بالکل آزاد ہے کہ اپنی ساری دولت ان جائز نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں صرف کر دے اور جتنا زیادہ عیش اڑا سکتا ہو اڑائے۔

لذاتِ دنیا میں انہماک کی مذمت

اسلام نے بنی نوع انسان کے لیے جو ضابطۂ حیات متعین کیا اس میں اس طرزِ عمل کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ ایک آدمی حدِ اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے خواہ وہ مباحات کے دائرہ ہی میں ہو عیش و آرام اور اس کی خاطر کسبِ مال کو عملاً اپنی زندگی کا مقصد بنا لے۔ مال و دولت کا مقصد قیامِ حیات ہے مگر خود قیامِ حیات بھی تو کچھ مقاصد کے تحت ہی مطلوب ہے۔ قیامِ حیات کے ضروری اہتمام کے بعد اسلام اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ انسان ان بلند تر مقاصد حیات کی طرف توجہ کرے اور اپنے فاضل مال و دولت کو ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے نہ کہ اُسے عیش کوشی اور تنعم کی نذر کر دے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عیش و عشرت میں غرق ہو جانے والی زندگی کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ قرآن کریم لذاتِ دنیا میں انہماک اور مبالغہ کی حد تک آرام و سہولت کی طلب سے بھرپور زندگی کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ

(الحدید : ۲۰)

"جان لو کہ دنیا (پرستی) کی زندگی لہو و لعب، زینت و آرائش، باہمی

مفاخرت اور مال و دولت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کا نام ہے۔"

اس قسم کی دنیا پرستانہ زندگی سے اجتناب کی تاکید کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

إِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَإِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ ۔

(مشکوٰۃ المصابیح باب فضل الفقراء)

"خبردار عیش کوشی سے اجتناب کرو کیونکہ اللہ کے اچھے بندے عیش کوش نہیں ہوتے۔"

دنیا کی لذتوں میں انہماک دراصل انسان کو آخرت سے غافل اور اپنی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کی طرف سے لاپروا بنا دیتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کے عہد میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ امت مسلمہ کے تمام افراد عموماً اور ریاست اسلامیہ کے اہل کار خصوصاً تنعم کی زندگی سے اجتناب کو اپنی عادت بنالیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک بار آذر بائیجان کے والی کے نام ایک خط میں اسی بات کی خاص تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

يَا عُتْبَةَ بْنِ فَرْقَدٍ إِيَّاكُمْ وَالتَّنَعُّمَ وَزِيَّ أَهْلِ الشِّرْكِ وَلَبُوْسَ الْحَرِيْرِ ۔

(سیرۃ عمر بن خطاب لابن جوزی، صفحہ ۱۳۰ مطبع دار السعادت مصر

"اے عتبہ بن فرقد خبردار عیش کوشی سے اجتناب کرنا اور اہل شرک کی

پوشاک سے اور ریشم کا لباس پہننے سے ۔

غرض اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ تنعم وعیش کوشی کی زندگی کو اسلام ناپسندیدہ قرار دیتا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے مگر یہ سب کچھ تعلیم و ترغیب ہدایت و رہنمائی اور اخلاقی دباؤ تک ہی محدود ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ موجودہ معاشرہ میں اخلاقی گرفت اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ محض اخلاقی بنیادوں پر تعلیم و ترغیب کو کافی سمجھتے ہوئے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح لذات میں انہماک کی خواہش لوگوں کے دلوں سے نکل جائے گی اور تنعم بے جا کے نتیجے میں معیشت میں جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کا سدِ باب ہو جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تنعم وعیش کوشی کی ممانعت میں اسلامی قانون کو کس حد تک دخل ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے تنعم وعیش کوشی کی ممانعت میں قانون کو جس حد تک دخل ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے اس حقیقت کی نشاندہی ضروری ہے کہ اخلاقی بنیادوں پر تعلیم و ترغیب کی بے اثری کا شکوہ کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ صورتِ حال اس معاشرے کی ہے جو مدتوں سے فساد کا شکار ہے اور جس میں انسان کی عملی زندگی کا کوئی گوشہ بھی صحت مند نہیں ہے۔ اسلام انسانی زندگی کے ہر گوشہ کی اصلاح کا علم بردار ہے۔ اسلام کے مثالی معاشرے میں اخلاقی دباؤ کے اثر و نفوذ کی صورتِ حال اس موجودہ معاشرے سے قطعاً مختلف ہوگی۔ اسلامی معاشرہ ایسے خطوط پر استوار ہوتا ہے کہ افرادِ معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے احساسِ ذمہ داری کی ایک ایسی اخلاقی فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ شریعت

کہ وہ مقاصد بھی جن کے حصول کے لیے اسلامی ریاست کو افراد کے حقوق میں مداخلت کا اختیار دیا گیا ہے افراد کے رضاکارانہ عمل سے حاصل ہونے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست قانون کا سہارا لینے سے پہلے اخلاقی دباؤ کے ذرائع استعمال کرتی ہے۔ جب تک اور جہاں تک اخلاقی طریقوں اور تعلیم و ترغیب کے ذریعہ انفرادی و اجتماعی مقاصد حاصل ہو سکتے ہوں جبر سے کام نہیں لیتی۔

عیش کوشی کی ممانعت کیلئے اخلاقی دباؤ کی حکمت

اخلاقی دباؤ کے تحت تعلیم و تربیت کے طریقہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے ایک طرف تو افرادِ معاشرہ کی اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور دوسری طرف انفرادی آزادی بھی مجروح نہیں ہوتی جس پر شریعت اسلامیہ کے تمام اوامر و نواہی کا دار و مدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ نے بہت سے ایسے مواقع پر جب کہ آپ قانونی طریقے اختیار کر سکتے تھے ترغیب و تلقین سے کام لیا اور متعلقہ افراد کو غلط طرزِ عمل ترک کرنے اور مطلوبہ مستحسن رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اسی قسم کا ایک سبق آموز واقعہ حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِیْ جَارًا یُؤْذِیْنِیْ قَالَ اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَتَاعَكَ اِلَى الطَّرِیْقِ فَانْطَلَقَ فَاَخْرَجَ مَتَاعَهٗ فَاجْتَمَعَ النَّاسُ اِلَیْهِ فَقَالُوْا مَا شَاْنُكَ قَالَ اِنَّ لِیْ جَارًا یُؤْذِیْنِیْ فَذَكَرْتُ لِلنَّبِیِّ فَقَالَ اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مَتَاعَكَ اِلَى الطَّرِیْقِ فَجَعَلُوْا یَقُوْلُوْنَ اَللّٰهُمَّ

اِلْعَنْهُ اَللّٰهُمَّ اَخْزِهٖ فَبَلَغَهٗ فَاَتَاهُ فَقَالَ اِرْجِعْ اِلٰی مَنْزِلِكَ فَوَاللّٰهِ لَا اُوْذِيْكَ ۔

(الادب المفرد للبخاری ص۲۱)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے تکلیف پہنچاتا ہے آپ نے فرمایا جاؤ اور اپنے گھر کا سامان نکال کر سڑک پر ڈال دو وہ آدمی گیا اور اس نے اپنا سامان باہر نکال دیا۔ پھر بہت سے لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا معاملہ ہے ۔ اس نے کہا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے تکلیف پہنچاتا ہے میں نے نبی صلعم سے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور اپنا سامان نکال کر سڑک پر ڈال دو۔ یہ سُن کر وہ لوگ کہنے لگے یا اللہ اس پر لعنت بھیج یا اللہ اس کو ذلیل کر اس پڑوسی تک یہ باتیں پہنچیں ۔ وہ اس آدمی کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تو اپنے گھر میں واپس آجا۔ خدا کی قسم اب میں تجھے تکلیف نہیں پہنچاؤں گا ۔

اس واقعہ سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فرد کو دوسرے فرد کی ایذا دہی سے بچانے کیلئے بجائے اس کے کہ کوئی قانونی اقدام فرماتے ایک نفسیاتی طریقہ اختیار کیا اور محض اخلاقی دباؤ سے اصلاح کا مقصد حاصل فرما لیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں اسی قسم کی اور متعدد مثالیں موجود ہیں جبکہ آپ نے نہایت حکیمانہ انداز میں رائے عامہ اور اخلاقی دباؤ کے استعمال کے ذریعہ انفرادی و اجتماعی اصلاح کا کام لیا۔ متعدد

بارالیسا ہوا کہ جہاد کی تیاری کے لیے یا بعض اہل حاجت کی حاجت روائی کے لیے مالی امداد کی ضرورت ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد معاشرہ پر کسی قسم کے محاصل وغیرہ عائد کرنے کے بجائے ان سے مالی تعاون کی اپیل فرمائی اور آپ کی اپیل کے نتیجے میں افراد معاشرہ نے اتنا مال حاضر کر دیا کہ ضرورت پوری ہو گئی۔

عیش کوشی کی ممانعت میں قانون کا دخل

غرض اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخلاقی دباؤ اور رائے عامہ کے دباؤ کو اصلاح کا ذریعہ بنانے کا طریقہ قانونی اقدام اور جبر کے استعمال سے کہیں بہتر ہے۔ رضامندی کے تحت انجام دیئے جانے والے کاموں میں جس حسن و کمال کی توقع کی جا سکتی ہے وہ جبر و قہر کے ذریعہ کرائے جانے والے امور میں متوقع نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اجتماعی زندگی میں ضابطہ بندی اور قانون کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ معاشرہ کتنا بھی صالح کیوں نہ ہو، افراد کی طبیعتوں کا مختلف ہونا لابدی امر ہے۔ ان میں خیر پسندوں کے ساتھ ساتھ شر پسندوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ افراد کے درمیان علم، پیش بینی، صبر و ضبط اور اسی قسم کی دوسری صفات کی کمی زیادتی پر بھی افراد کے غلط یا صحیح طرزِ عمل اختیار کرنے کا انحصار ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر صرف تعلیم و تربیت اور ترغیب و ہدایت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اجتماعی مفادات و مصالح کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ریاست افراد کے اعمال کی نگران بن کر رہے۔ شریعت مطہرہ کی دور بین نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ جو

کام بعض اوقات ترغیب و تلقین کے ذریعہ پورے نہیں ہوتے وہ قوت اور اقتدار کے ذریعہ بآسانی انجام پاجاتے ہیں - چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے -

اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ عَلیٰ بِالسُّلْطَانِ مَالَا یَزَعُ عَلیٰ بِالْقُرآنِ -

(سراج الملوک للطرطوشی صـ۴۹)

"اللہ سلطان کے ذریعہ ان امور کی نگرانی کر لیتا ہے - جن کی نگرانی قرآن کے ذریعہ نہیں کرتا"

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عثمان کی طرف بھی منسوب ہے - آپ فرماتے ہیں -

مَا یَزَعُ الْاِمَامُ اَکْثَرُ مِمَّا یَزَعُ بِالْقُرآنِ -

(احکام القرآن - قرطبی جلد ۶ - صـ۳۲۵)

"جتنا کچھ امام (بزور قانون) درست رکھتا ہے وہ اس سے زیادہ ہے جو قرآن (ترغیب کے ذریعہ) درست رکھتا ہے"

بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ ترغیب و تلقین کے ذریعہ کاموں کا انجام پاجانا بحیثیت مجموعی ایک بڑی اچھی بات ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ افراد معاشرہ اپنی انسانی فطری کمزوری کی بنا پر لبا اوقات غفلت اور کوتاہ بینی کا شکار ہو کر اہم اجتماعی مصالح کے تحفظ سے قاصر رہ جاتے ہیں - اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ ریاست اخلاقی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ قانون کی مدد سے بھی افراد کو ان حدود کا پابند بنا کر رکھے جو اجتماعی مفادات

و مصالح کے تحفظ کے لیے وضع کیے گئے ہوں۔

عیش کوشی کے سدِ باب کے لیے قانونی ذرائع

اب ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ بے جا تنعم و عیش کوشی کے سدِ باب کے سلسلہ میں اسلامی ریاست کون سے قانونی ذرائع استعمال کرنے کی مجاز ہے۔ اگر ایک شخص مباحات کے دائرہ میں تو رہتا ہے مگر عیش و آرام کی خاطر حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے بے دریغ مال و دولت خرچ کرتا ہے اور اجتماعی مفادات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تو کیا اسلامی فقہ کی رو سے اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قانونی طور پر اس شخص کے مالکانہ تصرفات پر پابندی لگا دے؟

دراصل مباحات کی حد تک بھی تنعم و عیش کوشی کی زندگی بسر کرنے کے مسئلہ پر جب ہم اس حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں کہ ایسی زندگی کے نتیجے میں فرد کے اپنے مصالح بھی مجروح ہوتے ہیں اور اجتماع کا نقصان بھی ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ اسلام کی نظر میں اس طرح کے غلط اور غیر مفید تصرفات کرنے والا شخص 'سفیہ' اور 'مفسد' قرار پاتا ہے اور سفیہ و مفسد شخص کے مالکانہ تصرفات پر فقہ اسلامی کی رُو سے پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ جو شخص عیش کوشی میں محو ہو جاتا ہے وہ صالح مقاصدِ زندگی کے لیے اپنا مال اور وقت صرف کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور اس طرح وہ ایسی زندگی گزارتا ہے جو شریعت کی منشاء کے خلاف ہے۔ لذاتِ دنیا میں انہماک انسان کو خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کا عادی بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ عقلِ عامہ اسی بات پر گواہی دیتی ہے کہ ایک بامقصد اور ذمہ دارانہ زندگی میں اس طرزِ عمل کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے کہ اپنی ساری دولت گوناگوں لذات

دنیوی سے لطف اندوز ہونے میں صرف کر دے اور زندگی کے دیگر بلند تر مقاصد کے حصول کی طرف کوئی توجہ نہ دے ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عیش کوشی میں محو رہنے والا شخص ایسی زندگی گزارتا ہے جو خواہشات نفس کی پیروی کا نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ تقاضائے عقل کے بھی خلاف ہے اور اسلام جس حد اگانہ طرزِ زندگی کا طالب ہے اس کے بھی منافی ہے اور یہی بات فقہ اسلامی میں ایک شخص کو سفیہ قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ہدایہ کے ایک شارح سید جلال الدین خوارزمی صاحب کفایہ نے سفہ، کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"سفہ شریعت کی منشاء کے خلاف عمل خواہشاتِ نفس کی پیروی اور تقاضائے عقل کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ سفیہ کو اخراجات میں تبذیر واسراف کی عادت ہوتی ہے۔ وہ ایسے تصرفات کرتا ہے جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا یا ایسا مقصد ہوتا ہے جسے دین دار اصحابِ عقل، معقول مقصد قرار نہیں دیتے۔ مثلاً مغنیوں کو مال دینا یا اڑنے والے کبوتروں کو بھاری قیمت ادا کر کے خریدنا۔ عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا اور نیکی و احسان کے کاموں میں فراخ دلی کا مظاہرہ شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ البتہ (ان کاموں میں بھی) اسراف حرام ہے جس طرح کہ کھانے پینے میں اسراف حرام ہے۔

(کتاب الحجر۔ باب الحجر للفساد)

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسراف بھی خواہ وہ مباحات ہی کی

حدود میں ہو "سفہ" میں داخل ہے اور اُسراف کا اطلاق تو فی الواقع ہوتا ہی ان
مصارف پر ہے جو شرعی حدود کے اندر تو رہ کر کئے گئے ہوں مگر ضرورت
سے زیادہ اور حد اعتدال سے متجاوز مصارف کی صف میں شمار ہوتے ہوں۔
غیر شرعی مصارف پر مال خرچ کرنے والے کو شریعت کی اصطلاح میں مبذر کے
نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مسرف بھی فقہ اسلامی کی رو سے سفیہ شمار
کیا جائے گا اور اس پر بھی حجر کیا جائے گا یعنی اسکے مالکانہ تصرفات پر بھی اسلامی
ریاست پابندی عائد کرنے کی مجاز ہوگی۔ اور اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ تنعم و عیش
کوشی کی زندگی گزارنے والا اسراف کا مرتکب ضرور ہوتا ہے۔

عیش کوشی کی ہر صورت "سفہ" میں داخل ہے

تنعم و عیش کوشی کے حصول کی خاطر مال خرچ کرنے کی صرف چار ہی صورتیں
ممکن ہیں اور چاروں صورتیں اسراف کے تحت آتی ہیں۔ عیش کوشی کے حصول
کی ایک صورت یہ ہے کہ جس غرض کی تکمیل مال کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے
کی جا سکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے آدمی اپنے مال کی زائد مقدار یا
صرف کرتا ہے۔ مثلاً محض نام و نمود اور اپنی دولت مندی کے زعم میں ایک چیز
کو بازار سے زیادہ گراں قیمت پر جانتے بوجھتے خریدتا پھرتا ہے۔ دوسری صورت
یہ ہے کہ ایک ضرورت ایک مخصوص وصفی معیار کے حامل سامان سے پوری ہو سکتی
ہو مگر عیش کوشی کی زندگی گزارنے والا اسی ضرورت کی تشفی کے لیے اس سامان سے
برتر وصفی معیار کے سامان کا طالب ہوتا ہو مثال کے طور پر آمد و رفت کی سہولت
عام معیار کی کاروں "ٹو یوٹا یا اوپل" وغیرہ کے ذریعہ بھی میسر آسکتی ہے مگر وہ

اس کی خاطر اعلیٰ معیار کی کاریں مرسڈیز یا رولس رائز خریدے۔ تنعم عیش کوشی کے حصول کی تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی اہم تر ضروریات کو نظر انداز کر کے غیر اہم امور پر مال صرف کرتا ہے۔ علاج اور علم کا حصول انسان کی بنیادی ضروریات میں شمار ہوتے ہیں مگر وہ نظر انداز کر کے اپنے گھر کی زیب و زینت پر بے دریغ دولت خرچ کرتا ہے۔ اور چوتھی صورت۔ عیش کوشی کی یہ ہے کہ اجتماع کے تمام معاشی ضرورتوں کی پرواہ کیے بغیر عیش کوشی کی زندگی گزارنے والا اپنے راحت و آرام کی خاطر فضول اخراجات کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ اب ذرا غور کیجئے عیش کوشی کے حصول کی خاطر مال صرف کرنے کی یہ چاروں شکلیں اسراف ہی کے تحت آتی ہیں عیش کوشی کا حصول ان چاروں صورتوں کے علاوہ ممکن ہی نہیں گویا اسراف کیے بغیر تنعم و عیش کوشی کی زندگی گزاری ہی نہیں جا سکتی اور جو شخص مسرف ہو وہ محولہ بالا عبارت کی رو سے "سفیہ" ہے اور "سفیہ" کے مالی تصرفات پر فقہ اسلامی کی رو سے حجر جائز ہے۔

یہ بات کہ مسرف پر بھی "سفیہ" کا حکم لگایا جا سکتا ہے سفیہ کی اصطلاح کی اس تعریف سے بھی ظاہر ہے کہ جو علامہ سرخسی نے المبسوط میں بیان کی ہے۔ علامہ سرخسی کے مطابق سفہ کی تعریف یہ ہے کہ۔

"سفہ شریعت کے منشاء کے خلاف عمل کا وہ نام ہے، وہ خواہشات نفس کی پیروی اور عقل و خرد کے تقاضے کی خلاف ورزی کا نام ہے عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا اور نیکی و احسان کے کاموں میں فراخ دلی کا مظاہرہ شرعاً پسندیدہ ہے لیکن ان کاموں میں تبذیر و اسراف

سے کام لینا شریعت اور عرف عام دونوں میں بُرا ہے "

(المبسوط جلد ۲۴ صہ ۱۵۵)

سفیہ کے مالی تصرفات پر پابندی کے جواز کے اصول پر فقہ اسلامی کے چاروں مکاتب کا اتفاق ہے ۔گو امام ابو حنیفہؒ کسی عاقل و بالغ آزاد مالک پر تبذیر و اسراف یا اضاعت مال کی بنا پر حجر کے قائل نہیں ہیں لیکن مختار قول حنفی مکتب فقہ میں بھی حجر کے جواز پر ہی ہے ۔غرض جمہور فقہائے اسلام تبذیر و اسراف اور مال کو ضائع کرنے کی بنار پر اسلامی ریاست کو حق دیتے ہیں کہ وہ ایسے شخص کے مالکانہ تصرفات پر مناسب پابندی لگا دے ۔اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں کہ اس سئلہ پر چاروں مکاتب فقہ کی طول طویل بحثوں کو نقل کیا جائے ۔جو صاحب تحقیق کے خواہاں ہوں وہ " الفقہ علی المذاهب الاربعہ " لعبدالرحمٰن الجزیری جلد دوم کے صفحات از ۴۷۸ تا ۴۸۳ مطالعہ فرمالیں ۔

سفیہ کے معاملے میں حجر کیے جانے سے متعلق جمہور فقہا کی اس رائے کا ماخذ قرآن کریم کی یہ آیت ہے :-

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللهُ لَكُمْ قِيَامًا .... فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۔

" اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لیئے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو .... پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو "

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مالکانہ تصرفات کے لیے رُشد ضروری ہے اور رُشد فقہا کی اصطلاح میں مالی تصرفات میں معقولیت کی راہ اختیار کرنے ہی کا نام ہے۔

غرض تنعم و عیش کوشی کے حصول میں اگر کوئی شخص اپنے مال میں ایسے تصرفات کرتا ہے جو مباحات کے دائرہ میں تو ہوں مگر حدِ اعتدال سے متجاوز ہوں اور ان تصرفات سے اس شخص کے ذاتی مفادات مجروح ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی مصالح کو بھی خطرات لاحق ہو رہے ہوں تو اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس شخص کے مالکانہ تصرفات پر مناسب پابندی عائد کر دے اس پابندی کی عملی شکلیں۔ حالات کی مناسبت سے متعین کی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تنعم و عیش کوشی کے عادی حضرات کو اسلامی ریاست بعض مدات میں اپنا مال صرف کرنے سے بالکل روک دے یا بعض مدات میں صرفِ مال سے پہلے ریاست کی اجازت کو ضروری قرار دے دے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے افراد کو تمام امور میں صرفِ مال سے پہلے ریاست کی اجازت کا پابند بنا دیا جائے۔

عیش کوشی کے مظاہر کی تعیین

اس سلسلہ میں البتہ ایک بات بڑی اہم ہے۔ وہ یہ کہ عیش کوشی کے مظاہر کی تعیین دورِ جدید کی زندگی میں چودہ سو برس پہلے کے پیمانوں سے ناپ کر نہیں کی جاسکتی۔ فنی ترقی کے اس دور میں وسائلِ معاش کی فراوانی کے باعث معیارِ زندگی میں پہلے کے مقابلہ میں بے حد تبدیلی آگئی ہے۔ البتہ یہ اصول اپنی جگہ برقرار ہے کہ مصارفِ زندگی کے بارے میں حدِ اعتدال سے تجاوز ہر دور میں مذموم رہا ہے

اور آج بھی مذموم ہے۔ اگر افراد معاشرہ میں حد اعتدال سے تجاوز کا رحجان پایا جائے تو اس کے سدِ باب کے لیے ریاست کو اختیار ہے کہ وہ اخلاقی دباؤ کے ساتھ ساتھ قانونی ذرائع سے بھی کام لے اور مناسب پابندیاں عائد کرے آج کے دور میں کوئی وجہ نہیں کہ ایک فرد کو اپنے ذاتی استعمال کے لیے متعدد قیمتی کاریں رکھنے سے نہ روکا جائے یا بے دریغ دولت صرف کر کے عالیشان محلات تعمیر کرنے سے منع نہ کیا جائے جبکہ دوسرے افراد معاشرہ اپنی ضرورت کیلئے ایک معمولی سی سائیکل رکھنے اور سر چھپانے کے لیے ایک جھونپڑی بنانے کی بھی ہمّت نہ رکھتے ہوں۔

اس تمام بحث سے تنعم و عیش کوشی کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر قارئین پر پوری طرح واضح ہو گیا ہو گا۔ اسلام ہر فرد کو اس کا تو پُورا پُورا اختیار دیتا ہے کہ وہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے دنیوی نعمتوں سے پُوری طرح لُطف اندوز ہو مگر اس میں بھی حد اعتدال سے تجاوز کو اسلام سخت ناپسندیدہ سمجھتا ہے اور تنعم و عیش کوشی کی ایسی زندگی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے جس کے نتیجے میں افراد کے ذاتی مفادات بھی مجروح ہوتے ہوں اور اجتماعی مصالح کو بھی نقصان پہنچتا ہو۔ اسلام اس قسم کی خطرناک صورتِ حال کے سدِ باب کے لیے افراد معاشرہ کی اخلاقی بنیادوں پر اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کو اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے قانونی ذرائع کو بھی بروئے کار لائے اور ایسے افراد کے مالی تصرفات پر مناسب قانونی پابندیاں عائد کر دے جو اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہوں۔

عیش کوشی کی قانونی ممانعت اور حضرت عمرؓ کا طرز عمل

اسلامی ریاست کے اس حق کی تائید میں کہ وہ تنعم و عیش کوشی کے سدِ باب کے لیے اخلاقی دباؤ کے ساتھ ساتھ قانونی ذرائع کو بھی بروئے کار لاسکتی ہے حضرت عمرؓ کے تعامل کو بھی بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ گو عامۃ الناس پر اس پر اس مقصد کے تحت آپ نے کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی صرف اخلاقی دباؤ پر ہی اکتفا فرمایا۔ مگر اپنے عمال کے لیے تنعم و عیش کوشی سے اجتناب کا اہتمام جس انداز سے آپ نے فرمایا وہ اس بات پر شاہد ہے کہ دنیوی نعمتوں سے تکلف اندوزی کے حصول میں حدِ اعتدال سے تجاوز آپ کو سخت ناپسندیدہ تھا اور اس کے سدِ باب کے لیے قانونی پابندیاں عائد کرنا کم از کم اپنے عمال کے لیے نہ صرف جائز اور روا سمجھتے تھے بلکہ ایسا کرنا اسلامی ریاست کے فرائض میں شامل سمجھتے تھے اس سلسلے میں چند مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔

جب کبھی کوئی شخص کہیں کا عامل مقرر کیا جاتا تھا تو اس سے کبار صحابہ کی موجودگی میں باقاعدہ عہد لیا جاتا تھا[1] کہ وہ "ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔ باریک کپڑے نہ پہنے گا۔ چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازے پر دربان نہ رکھے گا اور اہل حاجت کے لیے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا" یہ شرطیں اکثر پروانہ تقرری میں درج کی جاتی تھیں۔

جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تو اس کے مال واسباب کی مفصل فہرست

---

[1] کتاب الخراج ص۶۶

تیار کرالی جاتی۔ اگر اس کی مالی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا[1]۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری جو بصرہ کے گورنر تھے ان کے متعلق شکایت آئی کہ ان کے پاس ایک لونڈی ہے جس کو وہ دونوں وقت نہایت عمدہ غذا بہم پہنچاتے ہیں جب کہ اس قسم کی غذا عام مسلمانوں کو میسر نہیں۔ حضرت عمر نے فوراً حضرت ابوموسیٰ کو تحقیقات کے لیے مدینہ بلوایا اور الزام درست ثابت ہونے پر لونڈی ان سے چھین لی گئی[2]۔

اس طرح حضرت عیاض بن غنمؓ کے بارے میں ایک مرتبہ شکایت پہنچی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان رکھا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت محمد بن مسلمہ کو بھیجا کہ عیاضؓ کو جس حالت میں پائیں ساتھ لے آئیں۔ حضرت عیاضؓ باریک کرتا پہنے حضرت عمر کے پہنچے آپ نے وہ کرتا اتروا کر کمبل کا کرتا پہنایا اور بکریوں کا ایک ریوڑ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں لے جا کر چراؤ۔ حضرت عیاض نے تعمیلِ حکم کی اور آئندہ کے لیے دل سے توبہ کر لی۔ جب تک زندہ رہے نہایت خوبی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے[3]۔

حضرت سعد وقاص کو بھی ایسے ہی ایک معاملے میں حضرت عمرؓ نے

---

[1] فتوح البلدان ص۲۱۹

[2] طبری ص۲۷۱۳

[3] کتاب الخراج ص۶۶

نہایت سخت تنبیہ فرمائی۔ حضرت سعد وقاص نے کوفہ میں اپنی گورنری کے زمانہ میں اپنے لیے ایک محل بنوایا تھا جس میں ڈیوڑھی بھی تھی حضرت عمرؓ نے اپنے قاصد کو بھیج کر اس ڈیوڑھی کو آگ لگوادی۔

اپنے عمال کے بارے میں حضرت عمرؓ کی یہ سخت گیری اس بنا پر بھی تھی کہ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ سلطنت کے ارکان کا طرزِ معاشرت عامۃ الناس کی طرزِ زندگی پر بلاواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے ارکان سلطنت کی اصلاح گویا عامۃ الناس کی اصلاح کے مترادف تھی۔

غرض اپنے عمال کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ طرزِ عمل اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ آپ اپنے عمال کے لیے تنعم و عیش کوشی کی زندگی قطعاً پسند نہ فرماتے تھے اور ان کو حکماً اس بات پر مجبور کرتے تھے کہ وہ دنیوی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے میں حد اعتدال سے متجاوز نہ ہوں۔

دراصل دنیوی لذتوں میں انہماک انسان کو آخرت سے غافل اور اپنی دنیوی ذمہ داریوں کی طرف سے لاپرواہ بنا دیتا ہے۔ جو انسان عیش کوشی میں محو ہو جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ اور صالح مقاصد زندگی کے لیے اپنا مال اور وقت صرف کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اسلام جس طرز زندگی کا طالب ہے اس میں دنیوی نعمتوں اور لذتوں سے بہرہ ور ہونے کی گنجائش تو ہے مگر اسی حد تک جس حد تک وہ انسان کو اس کی اخروی اور دنیوی ذمہ داریوں سے غافل نہ بنا دے۔ آرام و آسائش، جمال آفرینی اور تزئین و آرائش انسان کی کارکردگی اور اس کے اخلاق پر اچھا اثر بھی ڈال سکتی ہے بشرطیکہ ان امور میں حد اعتدال سے تجاوز

نہ ہو۔ اسی لیے اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنے آرام و آسائش کے اہتمام اور زندگی کے بلند تر مقاصد کے حصول کی جد و جہد کے درمیان یک گونہ توازن برقرار رکھے۔ ظاہر ہے کہ تنعم و عیش کوشی میں محو انسان یہ توازن کسی طور بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔
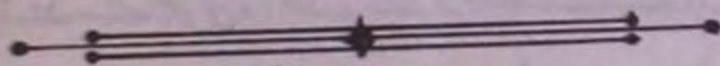
بُنیادی ضروریات کی فراہمی اور اسلام

نظامِ سرمایہ داری کی قیدِ معیشت کے نتیجہ میں جس معاشی ناہمواری سے آج ہم دوچار ہیں اس کی شدّت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آج ان بنیادی ضروریات تک کی فراہمی جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ بن کر رہ گئی ہے، اس قدر اہم کہ ہم سب کچھ بھول کر محض بُنیادی ضروریات کی فراہمی ہی کو اپنا منتہائے مقصود بنانے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو کوئی صحیح انسانی معاشرہ اس وقت تک وجود پذیر ہی نہیں ہوتا جب تک اس میں انسانی بُنیادی ضروریات کی فراہمی کا خاطر خواہ بندوبست نہ ہو اس لحاظ سے بنیادی فراہمی کسی انسانی معاشرہ کیلئے منتہائے مقصود نہیں بلکہ دیگر اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کیلئے زادِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حیوانوں کیلئے تو بیشک یہ مسئلہ منتہائے مقصود کی حیثیت رکھتا ہے مگر مقامِ انسانیت اس سے بہت بلند ہے۔ برا ہو اس نظامِ سرمایہ داری کا جس نے ہمیں مقامِ انسانیت سے گرا کر مقامِ حیوانیت پر لا کھڑا کیا مگر اس سے زیادہ برا ہو اس نظامِ اشتراکیت کا جو ہمیں یہ باور کرانے پر مصر ہے کہ یہی مقامِ حیوانیت دراصل مقامِ انسانیت کی معراج ہے اور اس لیے انسانی زندگی کے تمام مسائل انسان کے اسی مقام کو پیش نظر رکھ کر طے کرنا لازمی ہیں۔

بنیادی ضروریات کی اہمیت کا تعین

سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت اس باب میں دونوں افراط و تفریط کی راہ پر ہیں۔ افرادِ معاشرہ کے لیے بنیادی ضروریات کی فراہمی کا مسئلہ نہ اتنا غیر اہم ہے کہ اس سے بالکل ہی صرفِ نظر کر لیا جائے۔ اور ریاست کو اس سے کوئی سروکار ہی نہ ہو اور نہ انسانی زندگی میں اتنے اہم ترین مقام کا حامل ہے کہ انسان کی تمام کوششوں کا محور صرف اسی ایک مسئلہ کو سمجھ لیا جائے، اعتدال کی راہ صرف اسلام کی راہ ہے۔ اسلام کی نظر میں افرادِ معاشرہ کے لیے بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اسلامی ریاست کی ابتدائی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کی فکر سے بے نیاز کر کے انہیں دیگر بلند تر مقاصدِ حیات کے حصول کے لیے تیار کرے۔

اس سلسلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ کے لیے ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ضرور ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلامی ریاست اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ کوئی شخص اپنے مال سے یا اپنی محنت کے ذریعہ کسبِ مال کر کے ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں ہر فرد کو ایسی اشیاء اور خدمات فراہم کرتی رہے گی جو ان ضروریات کو پورا کرنے والی ہوں۔ یہ بات ناممکن بھی ہے اور اس کائنات کے فطری اصولوں کے بھی منافی ہے اسلامی ریاست کی ذمہ داری اس سلسلہ میں دراصل یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں ایسے حالات

و اسباب پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے جن کی موجودگی میں عام افرادِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات اپنے بل بوتے پر پورا کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسلامی معاشرہ ایسے خطوط پر استوار کیا جائے گا کہ بقدر ضرورت مال حاصل نہ کر سکنے والے افراد بآسانی اپنے خاندان یا عام افراد معاشرہ سے اتنی مدد حاصل کر سکیں گے جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ اس کے علاوہ سماجی تحفظ کے دیگر انتظامات بھی جائز اور ممکن حدود کے اندر کرنا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ان تمام انتظامات کے باوجود اگر کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہے تو پھر اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اس کے لیے ایسے وسائل حیات مہیا کرے جو ان ضروریات کی تکمیل کے لیے درکار ہیں۔ اسلامی ریاست کو اس بات کا انتظام کرنا ہوگا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اور بلا کسی رکاوٹ یا تاخیر کے سرکاری خزانے سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں۔

بنیادی ضروریات کی تعیین

شریعت اسلامیہ کی کسی نص کے ذریعے تو ان ضرورتوں کی کوئی صحیح تعیین نہیں کی جا سکتی جن پر انسانی بنیادی ضرورتوں کا اطلاق ہو سکے مگر یہ اصول ہر حال نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ ہر وہ ضرورت بنیادی ضروریات میں داخل ہے جس کی تکمیل پر کسی انسان کی زندگی کی بقا کا انحصار ہو، اور جس کی عدم موجودگی میں انسانی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو یا اس کے ضیاع کا احتمال ہو۔ اس اصول کی روشنی میں ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غذا، لباس، مکان،

اور بیماری کی حالت میں علاج، یہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان پر انسانی زندگی کی بقا کا دارومدار ہے اور اس لحاظ سے چاروں چیزیں لازمی طور پر بنیادی ضروریات میں شمار کی جائیں گی۔ متذکرہ اصول سے متعلقہ نصوص کے تحت اور ان کے مطابق عمل کی جو نظیریں ہمیں خلافت راشدہ کے عہد میں ملتی ہیں ان کی روشنی میں بھی یہی استنباط کیا جا سکتا ہے کہ ان ہی چار چیزوں، غذا، لباس، مکان اور علاج پر ہی انسانی بنیادی ضروریات کا اطلاق ہوتا ہے اور انہی چار چیزوں کی تکمیل متذکرہ بالا اصول کا لازمی تقاضا ہے۔

گو عام طور پر غذا، لباس، مکان اور علاج ہی چار ایسی بنیادی ضروریات ہیں کہ جن کی عدم تکمیل انسانی زندگی کو معرض خطر میں ڈال دیتی ہے مگر بعض حالات میں بعض افراد کے لیے اس بات کا امکان موجود ہے کہ ان چار ضرورتوں کے علاوہ بھی کچھ ضرورتیں بنیادی حیثیت اختیار کر لیں۔ مثال کے طور پر کسی ہاتھ پاؤں یا آنکھ وغیرہ سے معذور آدمی کے لیے ایک مستقل خادم کی ضرورت بھی بنیادی ضرورتوں میں شمار کی جائے گی۔ ایسی صورت میں بنیادی ضروریات کا دائرہ وسیع تر ہو جائے گا۔ بہرحال یہ اصول اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ کہ ہر وہ ضرورت بنیادی ضرورت ہے جس کی تکمیل پر کسی انسان کی زندگی کی بقا کا انحصار ہو۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داری

بنیادی ضروریات کے مفہوم کی اسی وسعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غالباً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں جزئیات کی تفصیل بیان نہیں فرمائی بلکہ

اپنے ارشادات کے ذریعہ نہایت جامع انداز میں یہ اصول متعین فرمایا کہ اصحاب امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔ ابوداؤد کتاب الخراج والفئ والامارۃ میں ابومریم ازدی سے ایک روایت لائے ہیں وہ فرماتے ہیں

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ شَيْئًا مِنْ أُمُوْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ اِحْتَجَبَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ دُوْنَ حَاجَتِهٖ وَخَلَّتِهٖ وَفَقْرِهٖ۔

(باب فیما یلزم الامام من امر الرعیۃ والاحتجاب عنہم)

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جسے اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگراں بنایا اور وہ انکی ضروریات اور فقر سے بے پرواہ ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالی بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جامع ارشاد نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی صاحب امر ضرورت مند افراد کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو اللہ کی سخت ناراضگی مول لے گا۔ فقر کے لفظ نے غذا، لباس، مکان اور علاج چاروں بنیادی ضروریات کا احاطہ کر لیا اور حاجۃ وخلّۃ کے الفاظ میں وہ دیگر تمام بنیادی ضروریات آگئیں جن کا امکان بعض حالات میں بعض افراد کے لیے مقصود ہو سکتا تھا۔ اس حدیث میں بیان کردہ وعید اس بات کی وضاحت کے لیے بھی کافی ہے محروم افراد کی بنیادی ضروریات

کی تکمیل اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ترین ذمہ داری ہے۔
یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث جب امیر معاویہؓ کو ابو مریم ازدی نے سنائی تو حضرت
امیر معاویہؓ نے فوراً ایک آدمی عوام کی ضروریات پوری کرنے پر مامور فرما دیا
اسی قسم کی ایک روایت امام ترمذی لائے ہیں :-

قَالَ عَمْرُو بْنُ مُرَّةَ لِمُعَاوِيَةَ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ
صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا مِنْ اِمَامٍ یُغْلِقُ
بَابَهٗ دُوْنَ ذَوِی الْحَاجَةِ وَالْخَلَّةِ وَالْمَسْکَنَةِ اِلَّا اَغْلَقَ
اللّٰهُ اَبْوَابَ السَّمَاءِ دُوْنَ خَلَّتِهٖ وَحَاجَتِهٖ وَمَسْکَنَتِهٖ
فَجَعَلَ مُعَاوِیَةُ رَجُلًا عَلٰی حَوَائِجِ النَّاسِ :-

(ترمذی ۔ کتاب الاحکام باب ماجاء فی امامۃ الرعیۃ)

"عمرو بن مرہ نے معاویہؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو یہ فرماتے سنا ہے کہ " جو امام ضرورت مندوں، فقراء اور مساکین
پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ اس کی ضروریات فقر اور مسکینی
پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے (یہ سن کر) معاویہؓ نے ایک
آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے پر) مامور کر دیا"

ان احادیث کے الفاظ سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ تکمیل ضروریات
کی ذمہ داری اسلامی ریاست کی ابتدائی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ کیونکہ
کوئی صاحب امر اگر پہلے ہی مرحلہ میں اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ
ہو گا تو وہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں اللہ کی نصرت سے محروم ہو جائے گا

اور ظاہر ہے ایک صاحبِ امر کی ضروریات میں وہ حاجتیں بھی شامل ہیں جو امور ریاست کے نگران ہونے کی حیثیت سے اسے لاحق ہوتی ہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت، خلافت، کی اس تعریف سے بھی ہوتی ہے جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور جسے سن کر کعب احبار رضی اللہ عنہ نے اسکی تصویب فرمائی ہے۔

عَنْ سَلْمَانَ قَالَ اِنَّ الْخَلِيْفَةَ هُوَ الَّذِيْ يَقْضِيْ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَيُشْفِقُ عَلَى الرَّعِيَّةِ شَفْقَةَ الرَّجُلِ عَلٰى اَهْلِهٖ فَقَالَ كَعْبُ الْاَحْبَارِ صَدَقَ۔

(ابو عبید القاسم۔کتاب الاموال ص۶)

"سلمانؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے۔ یہ سُن کر کعبؓ بن احبار نے کہا سچ کہا"

ظاہر ہے خلافت کا اصل مقصد تو قانون الٰہی کا نفاذ ہی ہے مگر اس کے فوراً بعد شفقت علی الرعیۃ کا ذکر کر کے یہ بتلا دیا کہ خلیفہ کے لیے جتنا اہم کام قانون الٰہی کا نفاذ ہے اتنا ہی اہم یہ کام بھی ہے کہ وہ رعیت سے شفقت کا برتاؤ رکھے اور شفقت بھی کیسی، جیسے ایک آدمی کو اپنے اہل وعیال سے ہوتی ہے کہ وہ ان کی صرف بنیادی ضرورتوں ہی کی فکر نہیں کرتا بلکہ ان کو ہر طرح کے آرام اور ہر قسم کی راحتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی بات

کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر رعیت کی خیر خواہی سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا۔

مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيحَةٍ لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ۔

(بخاری کتاب الاحکام باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح)

"جس بندے کو خدا نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اس کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔"

کسی آدمی کے ساتھ خیر خواہی کا اولین تقاضا یہی ہے کہ جن ضروریات کی عدم تکمیل سے اس کی جان ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو ان کو پورا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

غرض اسی قسم کے متعدد ارشادات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں یہ بات پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ معاشرہ کے محروم افراد کے لیے بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدینؓ کو بھی اپنی اس ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا۔ اور یہ بات خلافتِ راشدہ تک ہی محدود نہیں، اس مبارک دور کے بعد بھی اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو دیگر امور کے لحاظ سے خلافتِ اسلامیہ میں اختلال پیدا ہو گیا تھا مگر جہاں تک محروم افراد کے لیے بنیادی ضروریات

کی فراہمی کا تعلق ہے ہر دور کی اسلامی ریاست کے ہر صاحبِ امر کو اپنی اس ذمہ داری کا شدت سے احساس رہتا تھا۔ چنانچہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ پورا پورا اہتمام کرتا تھا۔

خلفائے راشدین کا احساس ذمہ داری

خلافتِ راشدہ کا تو پورا دور۔ بہرحال اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر خلفائے راشدین اپنی اس ذمہ داری کے بارے میں متفکر رہتے تھے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اسی فکر نے صرف دو سال کے قلیل عرصہ میں ہی وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی اس ذمہ داری کا اس قدر احساس تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔

لَوْمَاتَ جَمَلٌ ضِيَاعًا عَلٰى شَطِّ الْفُرَاتِ لَخَشِيْتُ اَنْ يَّسْأَلَنِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔

(محمد ابن سعد: الطبقات الکبریٰ۔ جلد ۳ ص ۳۰۵)

"اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا"

ایک موقعہ پر ایک عام خطبہ میں اپنی ذمہ داریاں گناتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ كَلَّفَنِيْ اَنْ اَصْرِفَ عَنْهُ الدُّعَاءَ

(قواعد الاحکام۔ ابو محمد عز الدین)

"لوگو اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اس کے حضور

کی جانے والی دعاؤں کو روکوں "

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کی تشریح کرتے ہوئے مشہور شافعی فقیہ ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام لکھتے ہیں :-

"اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری کرے تاکہ ان کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ رب العالمین سے ان کی تکمیل کے طالب ہوں "

اپنی اس ذمہ داری کے احساس کو عملی جامہ پہنانے میں حضرت عمرؓ کے اہتمام کا کیا حال تھا اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸ھ کے مشہور قحط میں عام مسلمانوں کی فکر نے آپ کی صحت کو بُری طرح خراب کر دیا تھا اور آپ کا رنگ تک سیاہ پڑ گیا تھا۔ ۱۸ھ کا قحط جس کو اسلامی تاریخ میں عام الرّمادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس قدر شدید تھا کہ نو ماہ تک پورے حجاز میں فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا۔ اس زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غذائی اجناس کی عام تقسیم اور سرکاری طور پر ہزاروں افراد کے لیے کھانا پکوا کر دونوں وقت کھلانے کا انتظام کیا۔ دوسرے علاقوں اور مصر و شام جیسے دور دراز ممالک سے غلّہ، آٹا، چربی اور تیل وغیرہ اونٹوں پر بار کرا کرا کر منگوایا۔ ہزاروں کی تعداد میں مویشی اور اونٹ باہر سے منگوا کر ذبح کرائے اور پورے قحط زدہ

علاقے میں لوگوں کو عام اجازت دے دی کہ مدینہ آکر سرکاری قافلوں سے اپنی ضرورت کی چیزیں لے لیں۔ دن بھر آپ ان انتظامات میں مصروف رہتے اور راتیں رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہو کر دعاؤں میں گزار دیتے قحط کی فکر نے آپ کا یہ حال کر دیا تھا کہ قحط کے بعد صحابہؓ کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ عام الرمادہ کا قحط دور نہ کر دیتا تو ہمیں اندیشہ تھا کہ عمرؓ مسلمانوں کے اس مسئلہ کی فکر کرتے کرتے مر جائیں گے۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اس ذمہ داری کو پوری طرح نبھایا۔ یہ اسی ذمہ داری کا عملی مظاہرہ تھا کہ حضرت عثمانؓ ایک قحط کے موقعہ پر غلہ سے لدے ہوئے سینکڑوں اونٹ بازار میں منہ مانگے داموں پر فروخت کرنے کے بجائے مستحقین پر خیرات کر دیتے ہیں۔ اور یہ اسی ذمہ داری کا تقاضا تھا کہ حضرت علیؓ خود متواتر بھوکا رہ کر اپنے حصے کا کھانا بھی دوسرے بھوکوں کو کھلا کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد بھی اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں۔ خلفائے بنو امیہ نے عطایا کا ایک مستقل محکمہ اس مقصد کے لیے قائم کیا ہوا تھا۔ خلفائے بنو عباس نے نہ صرف اس کو قائم رکھا بلکہ مزید منظم کیا حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں اوپر گزر ہی چکا ہے کہ آپ نے لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے خاص طور سے ایک آدمی مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے واضح طور پر اعلان کیا ہوا تھا۔

وَمَا اَحَدٌ مِنْكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَاجَتُهٗ اِلَّا حَرَصْتُ اَنْ

اَسُدَّ مِنْ حَاجَتِہٖ مَاقَدَرْتُ عَلَیْہِ۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز - ابن عبدالحکم)

"تم میں سے جس کسی کی بھی ضرورت کا مجھے علم ہو گا اس کی ضرورت پوری کرنے کی میں حتی الامکان پوری کوشش کروں گا۔"

خلفائے بنو عباس میں سے ہارون اور مامون کو خاص طور سے اپنی اس ذمہ داری کا اس قدر احساس تھا کہ یہی احساس انہیں دریافت احوال کے لیے گلیوں میں لئے لئے پھرتا تھا۔

غرض جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس باب میں بڑے واضح ہیں کہ بنیادی ضروریات کی فراہمی اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمہ داری ہے وہاں اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اس پر عمل کی نظریں اس بات پر شاہد ہیں کہ اسلامی ریاست کے منصب صدارت پر فائز ہونے والے ہر فرد نے اس ذمہ داری کو باحسن وجوہ نبھانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

اسلام بنیادی ضروریات کی فراہمی سودے بازی کی بنیاد پر نہیں کرتا

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ غور امر یہ ہے کہ افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات کی فراہمی اسلامی ریاست اپنا فرض سمجھ کر کرتی ہے۔ اس کے عوض وہ افراد سے کسی خدمت یا کسی معاوضہ کی طالب نہیں ہوتی۔ اس فرض کی ادائیگی میں اسلامی ریاست کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ اس طرح افراد معاشرہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہو سکیں گے اور زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لے سکیں گے۔ اسلام بنیادی ضروریات کی فراہمی سودے بازی کی بنیاد پر

پر نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں اسلام اور سوشلزم کے درمیان بنیادی فرق ہی یہ ہے۔ سوشلزم بنیادی ضروریات فراہم کرتا ہے مگر افراد کی صلاحیتِ کار کی قیمت کے طور پر۔ ان کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرتا ہے۔ مگر جانوروں کی طرح ان سے دن رات کام لے کر۔ اس کے بعد بھی ان کو طرح طرح کی پابندیوں میں جکڑ کر ان کی آزادی ضمیر کو نفع کے طور پر وصول کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات ان کا انسانی حق سمجھ کر فراہم کرتا ہے اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی صلاحیت کار کو جہاں چاہیں استعمال کریں اور پوری آزادی کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں حصہ لیں۔

چند دیگر اہم ضروریات اور اسلامی ریاست کی ذمہ داری

اب تک کی بحث صرف ان ضروریات تک محدود رہی ہے جن پر انسانی زندگی کی بقا کا انحصار ہے اور جن کو اسلام کے علاوہ دوسرے نظامہائے معاش نے بھی انسانی بنیادی ضروریات میں شمار کرتے ہوئے ریاست کو کسی نہ کسی شکل میں ان کی فراہمی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے مگر اب ہم چند ایسی ضروریات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو بنیادی ضروریات میں تو داخل نہیں ہیں مگر اجتماع کو خلل سے بچانے اور اُسے صحیح خطوط پر استوار رکھنے کے لیے انکا اہتمام بھی انتہائی ضروری ہے اور اسی بنا پر اسلام نے ان کی فراہمی کو بھی مخصوص حالات میں اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے۔

عام تعلیم

اس قسم کی ضروریات میں ایک اہم ضرورت عام تعلیم کی ہے۔ متعدد

احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابہؓ کرام عام تعلیم کے اہتمام کو بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ بدر کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد قیدیوں کا یہ فدیہ قرار دیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک قیدی مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دے[1]۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے حضرت سعیدؓ بن العاص کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ وہ مدینہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں[2]۔ اصحاب صفہ کے بارے میں ہے کہ وہ قرآن کریم اور احادیثِ نبوی حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے تھے۔ چنانچہ ابو داؤد کتاب البیوع میں باب فی کسب المعلم کے تحت ایک روایت لائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبادہؓ بن صامت نے اصحاب صفہ میں سے چند صحابہؓ کو لکھنا بھی سکھایا تھا۔ ایک بار عرب کے چند قبائل کی فرمائش پر ان کے عوام کو دین سکھانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر قرار صحابہؓ کو روانہ فرمایا تھا۔

ان تمام روایات کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے پیمانے پر خاص طور سے اس کا اہتمام فرمایا تھا کہ مسلمان دین کا علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں کی تعلیم کے لیے باقاعدہ اساتذہ مقرر

---

[1] محمد ابن سعد : الطبقات الکبریٰ : جلد ۲ : ص۲۲
[2] الاستیعاب فی معرفۃ الصحابہ از ابن عبدالبر : جلد ۱ : ص۳۹۳

کیے ہوئے تھے جو بیت المال سے ماہوار تنخواہ پاتے تھے طبقات ابن سعد میں ہے۔

عَنِ الْوَضِیْنِ بْنِ عَطَاءٍ قَالَ ثَلَاثَةٌ كَانُوْا بِالْمَدِيْنَةِ يُعَلِّمُوْنَ الصِّبْيَانَ وَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَرْزُقُ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ دِرْهَمًا كُلَّ شَهْرٍ۔

(طبقات ابن سعد جلد ۳ صـ ۲۲۲)

"وضین بن عطاء سے مروی ہے، انہوں نے کہا کہ مدینہ میں تین آدمی تھے جو بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اور عمر بن خطاب ان میں سے ہر ایک کو پندرہ درہم ماہانہ دیا کرتے تھے"

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے بھی دیہات کے مسلمانوں کو تعلیم دینے کے لیے تنخواہ دار معلم مقرر کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ کنز العمال میں ابن زنجویہ کے حوالے سے کنانۃ العدوی کی اس بارے میں ایک روایت ملتی ہے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے ایسے افراد کے لیے جو حصول تعلیم کی مشغولیت کی بناء پر اپنی روزی آپ کمانے سے قاصر تھے وظائف بھی مقرر کیے تھے [1]۔

غرض ان تمام احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عام تعلیم کے اہتمام کو بھی اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمہ داریوں میں شمار کرتا ہے۔

متوفی کے قرضہ کی ادائیگی

بنیادی ضروریات کے علاوہ دیگر ایسی ضروریات میں سے جن کے اہتمام

---

[1] ابو عبید، کتاب الاموال: صـ ۲۶۱

میں اسلام کو امتیازی حیثیت ہے ایک ضرورت کسی شخص کے وفات پاجانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے قرضہ کی ادائیگی بھی ہے۔ فتوحات کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمادیا کہ۔

أَنَا أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّيَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ فَعَلَيَّ قَضَاءُهُ۔ (ابوعبید کتاب الاموال صـ۲۲۰)

"مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے بس جو مقروض وفات پاجائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی"

امام بخاری کتاب النفقات میں (باب "قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ترک کلاً او ضیاعاً فالیَّ" کے تحت) اس قسم کی ایک روایت لائے ہیں جس کے الفاظ ہیں۔

فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْفُتُوْحَ قَالَ :- أَنَا أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَتَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ قَضَاءُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ۔

"پھر جب اللہ نے آپؐ پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو آپؐ نے فرمایا مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے۔ لہٰذا جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہوگا"

ان احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متوفی کے قرض کی ادائیگی کی اپنی طرف نسبت، ظاہر ہے، اسلامی ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے فرما رہے ہیں۔ آپ کے یہ الفاظ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ اگر ریاستِ اسلامی کے خزانے میں دوسری ضروریات کی تکمیل کے بعد گنجائش ہو تو اس کے ذمہ اُن مرنے والوں کے قرض کی ادائیگی بھی ہے جنہوں نے اتنا ترکہ نہ چھوڑا ہو جو ادائے قرض کے لیے کافی ہو۔

متوفی کی بے سہارا اولاد کی کفالت

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض کے علاوہ متوفی کی دوسری ذمہ داریوں مثلاً بے سہارا اولاد کی کفالت کے سلسلہ میں بھی اسی قسم کا اعلان فرمایا تھا۔ ترمذی ابواب الفرائض میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِاَهْلِهٖ وَمَنْ تَرَكَ ضِیَاعًا فَاِلَیَّ هٰذا حدیث حسن صحیح ...... وَمَعْنٰی قَوْلِهٖ تَرَكَ ضِیَاعًا یَعْنِیْ ضَائِعًا لَیْسَ لَهٗ شَیْءٌ فَاِلَیَّ یَقُوْلُ اَنَا اَعُوْلُهٗ وَاُنْفِقُ عَلَیْهِ۔ (باب ماجاء من ترك مالاً فلورثته)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو (کسی کو) بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

(امام ترمذی فرماتے ہیں) کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔۔۔۔ ترک
ضیاعًا کے معنی یہ ہیں کہ اس حال میں چھوڑ جائے کہ اس کے پاس کچھ
بھی نہ ہو فَاِلَیَّ کے معنی یہ ہیں کہ میں اس کی کفالت کروں گا اور اس
پر مال خرچ کروں گا۔"

اسلامی ریاست کی حیثیت ایک سرپرست کی سی ہے

بہر حال ان آثار و حدیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاں
اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ محروم افراد کے لیے بنیادی ضروریات
کی فراہمی کا اہتمام کرے وہاں اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حتی الامکان
ان ضروریات کی طرف بھی توجہ دے جو بنیادی ضروریات کے درجہ میں تو
نہیں ہیں مگر اجتماع کے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر ان کا اہتمام بھی ضروری ہے
شریعت نے دراصل اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا سرپرست قرار دیا
ہے اور سرپرستی کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ وہ ان کی ضروریات کی تکمیل کا
اہتمام کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ مَوْلٰی مَنْ لَا مَوْلٰی لَہٗ۔

(ترمذی ابواب الفرائض باب ماجاء فی میراث المال)

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا
رسولؐ ہے"

ایک اور موقعہ پر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَہٗ۔ (ترمذی ابواب النکاح)

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔"

گو متذکرہ بالا دونوں احادیث امام ترمذی ابواب الفرائض اور ابواب النکاح کے تحت لاتے ہیں مگر حکومت کی سرپرستی صرف میراث یا نکاح کے معاملوں تک محدود نہیں بلکہ ایک عمومی سرپرستی ہے جس میں افرادِ معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل اولین حیثیت رکھتی ہے۔ اس بات کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خط سے ہو جاتی ہے جو آپؐ نے قبیلہ حمیر کے سردار زرعہ بن یزن کے نام لکھا تھا۔ آپ اس خط میں قبیلہ کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وَاٰمُرُكُمْ يَا حِمْيَرُ خَيْرًا فَلَا تَخُونُوا وَلَا تَخَاذَلُوا وَاِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ مَوْلٰى غَنِيِّكُمْ وَفَقِيْرِكُمْ وَاِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِاَهْلِهٖ اِنَّمَا هِيَ زَكٰوةٌ تَزَكَّوْنَ لِفُقَرَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔۔۔۔ (ابو عبید کتاب الاموال صفحہ ۴۳)

"اے اہل حمیر! میں تم کو بھلی روش کی تلقین کرتا ہوں، نہ خیانت کرنا اور نہ مخالفانہ روش اختیار کرنا، اللہ کا رسولؐ تمہارے غنی اور فقیر تمام لوگوں کا سرپرست ہے۔ صدقہ کا مال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، یا اس کے گھر والوں کے لئے جائز نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ ہے جسے تم (اپنی پاکیزگی کے لیے) غریب مسلمانوں کے لیے نکالتے ہو۔"

اس خط میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کا مال ضرورتمند مسلمانوں کے لیے وہاں یہ اطمینان بھی دلایا گیا ہے کہ جو فرد بھی ضرورت یا مصیبت سے پریشان ہوگا خواہ وہ مال دار ہو یا مفلس اللہ کا رسولؐ اس کو سہارا دینے کے لیے موجود ہے۔ ظاہر ہے یہاں رسول اللہ کے الفاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حیثیت مراد ہے۔ جو اسلامی ریاست کے سربراہ کے طور پر آپؐ کو حاصل تھی۔

غرض سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں ضروریات زندگی کی فراہمی آج اگر ہمارے لیے ایک اہم مسئلہ ہے تو یہ بات چیلنج کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اس کا صحیح اور مناسب ترین حل صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ وہ لوگ جو ضروریات زندگی کی فراہمی کو مطمح نظر بنا کر اشتراکیت کے کھوکھلے اور پُر فریب نعروں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ ذرا آنکھیں کھولیں اور غور کریں کہ وہ ان ضروریات کی تکمیل اسلام کے سایۂ عاطفت میں رہ کر کرنا چاہیئے ہیں یا اشتراکیت کے پنجۂ استبداد میں پس کر۔ روٹی، کپڑا اور مکان آزادی ضمیر بیچ کر اور اپنے بنیادی حقوق تک سے دست بردار ہو کر حاصل کرنا چاہتے ہیں یا بلا کسی معاوضہ یا بدلہ کے اپنے انسانی حق کے طور پر وصول کرنا چاہتے ہیں۔ خوب غور کر لیں، پہلی راہ اشتراکیت کی راہ ہے اور دوسری راہ اسلام کی جنت ارضی کی طرف جاتی ہے۔ صحیح انتخاب عقل کی صحیح رہنمائی پر منحصر ہے۔

گرانی کے مصنوعی عوامل

اِسلام کی نظر میں

وطن عزیز پاکستان میں جس ہوش ربا گرانی سے آج ہمیں واسطہ درپیش ہے اس کی اصل اور سب سے بڑی وجہ تو تقسیم دولت کی ناہمواری اور سرمایہ دارانہ معیشت کے سودی نظام کا رواج ہی ہے مگر اس کے پس منظر میں فی الواقعی وہ ذہن کام کر رہا ہے جو سرمایہ داری کے خود غرض مفاد پرست نظام معیشت کی لازمی پیداوار ہے اور جس کا نصب العین ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی من مانی نفع اندوزی کے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ اشیار کی قیمتیں دن بدن جس تیز رفتاری سے چڑھتی چلی جا رہی ہیں ان کا اصل سبب وہ عوامل ہیں جن کو بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار اپنے نفع کی شرح کو بڑھاتے رہنے اور بازار کی قیمتوں کو اپنے من مانے معیار پر قائم رکھنے کے لیے ہتھکنڈوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ان کے استعمال کو کاروباری فن شناسی کا نام دے کر اس پر فخر کرتے ہیں۔ مال کو روکے رکھنا یا ضائع کر دینا، اشیار کا معیار گرا دینا، سماجی ضرورت سے کم مقدار میں مال تیار کرنا، یہی وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے

ایک کاروباری بازار کی قوتوں پر غیر معمولی قابو حاصل کرتا ہے اور اشیاء کو گراں کر کے بے جا نفع اندوزی اور عام افرادِ معاشرہ کے استحصال کا ذریعہ بناتا ہے۔

قیمتوں کے تعین کا معاشی اصول

علم معاشیات سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ بازار میں کسی شے کی فطری قیمت کا تعین اس شے کی رسد اور طلب دونوں کے برابر ہونے پر منحصر ہے۔ طلب کا تعلق خریداروں سے ہے۔ اگر ایک شے کی قیمت گر جائے تو وہ اس شے کو زیادہ خریدتے ہیں یعنی اس شے کی طلب بڑھ جاتی ہے اور اگر اس شے کی قیمت چڑھ جائے تو خریدار اسے کم مقدار میں خریدتے ہیں اس طرح اس شے کی طلب گھٹ جاتی ہے۔ جہاں تک رسد کا تعلق ہے تو اس کا انحصار فروخت کرنے والوں پر ہے۔ جب کسی شے کی قیمت چڑھ جاتی ہے تو وہ اس شے کو زیادہ مقدار میں بیچنے کے لیے بازار میں لاتے ہیں اور اگر گر جائے تو اس کی مقدار کم کر دیتے ہیں اور اس طرح رسد بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ رسد اور طلب کی ان دونوں طاقتوں کے باہم ملنے سے توازن قائم رہتا ہے۔ رسد کے بڑھ جانے سے قیمت گر جاتی ہے اور طلب کے بڑھنے سے قیمت چڑھ جاتی ہے۔ جب ان دونوں طاقتوں کا زور باہم برابر ہو تو جو قیمت کسی شے کی مقرر ہو گی اُسے متوازن قیمت یا (Equilibrium Price) کہا جائے گا اور یہی قیمت کسی شے کی فطری قیمت ہو گی۔

مصنوعی گرانی کی وجہ

اب وہ لوگ جو من مانی نفع اندوزی کی فکر میں رہتے ہیں وہ رسد اور طلب کو اپنی باہمی فطری روش پر قائم نہیں رہنے دیتے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کی اشیاء کی قیمت روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائے اور اسی نسبت سے ان کے منافع کی شرح بڑھتی رہے۔ اس مقصد کی خاطر جہاں وہ اشیاء کی طلب بڑھانے کے لیے غلط اور مبالغہ آمیز اشتہار بازی، عیب دار مال کو اچھا بنا کر پیش کرنے اور گھٹیا مال کو بظاہر بلند معیار بنا کر سامنے لانے کے طریقے اختیار کرتے ہیں وہاں نت نئے طریقوں سے ان اشیاء کی رسد گھٹانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ مال کو روک رکھنا، کچھ حصہ مال کا ضائع کر دینا، اشیاء کا معیار گرا دینا اور سماجی ضرورت سے کم مقدار میں مال تیار کرنا وغیرہ یہ وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعہ اشیاء کی رسد کو خاطر خواہ مقدار میں بآسانی گھٹایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ من مانی نفع اندوزی کے رسیا تاجر اور صنعت کار ان تمام ذرائع کو اپنے کام میں لاتے ہیں اور اس طرح مصنوعی گرانی پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

مصنوعی گرانی کا سدِ باب

نظامِ سرمایہ داری کی بے قید معیشت میں اس صورت حال کا کوئی علاج نہیں اور علاج کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے کیونکہ نظامِ سرمایہ داری میں تو ان تمام متذکرہ ذرائع کے استعمال کو ایک طرح سے قانونی حیثیت حاصل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت بے قید حق ملکیت کا جو تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی رو سے مالک کو اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا پورا پورا اختیار ہے۔ ایک

شخص کو پورا حق ہے کہ چاہے تو اپنے مال کو فروخت کے لیے بازار میں لائے اور چاہے تو فروخت کرنے کے بجائے اپنے پاس روکے رکھنے کو ترجیح دے جب چاہے اپنے مال سے استفادہ کرے اور جب چاہے اسے ضائع کر دے اس کی مرضی ہے کہ جس مقدار اور جس وصف کا حامل مال تیار کرنا چاہتا ہے کرے ریاست کو کوئی حق نہیں کہ کسی شخص کے اس قسم کے تصرفات میں کوئی دخل دے کیونکہ نظام سرمایہ داری کے نزدیک ایسا کرنا بازار کے فطری عمل میں دخل دینے کے مترادف ہے اور معیشت کے لیے فساد کا باعث ہے۔

اس موقعہ پر بعض کوتاہ فہم یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ اسلام بھی چونکہ مالک کو اپنے اموال میں ہر طرح کے تصرفات کا حق دیتا ہے اس لیے اسلامی نظامِ معیشت کے پاس بھی ان محولہ بالا معاشی بیماریوں کا کوئی علاج نہیں اور اسی دلیل کی بنیاد پر ان کا کہنا یہ ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی نظامِ معیشت بروئے کار آ بھی گیا تو متذکرہ بالا خرابیوں کا کوئی تدارک نہ ہو سکے گا اور من مانی نفع اندوزی کا جو رحجان آج اپنے عروج کو پہنچا ہوا ہے، نہ صرف یہ کہ وہ باقی رہے گا بلکہ اس کو تقویت ملے گی، کیونکہ ان کے بقول اسلامی نظامِ معیشت میں نفع کی حد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایک شخص جتنے نفع پر چاہے اپنا مال فروخت کرے، اسلام اس کی پوری اجازت دیتا ہے اسی طرح اسلام اس پر بھی کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ جس مال کو فروخت نہ کرنا چاہے اسے بالضرور فروخت کرے۔ غرض ان اصحاب کی رائے میں اسلامی نظامِ معیشت میں ایسی کوئی پابندی نہیں جس کے ذریعہ ان مذکورہ بالا عوامل کی روک تھام

ہو سکے جو مصنوعی گرانی کا سبب بنتے ہیں۔

دراصل ان حضرات کا یہ اعتراض اسلامی نظامِ معیشت کے سطحی مطالعہ پر مبنی ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر یہ سمجھ رکھا ہے کہ بے قید حق ملکیت کا جو تصوّر نظامِ سرمایہ داری نے دیا ہے اسلام میں بھی شخصی ملکیّت کے حق کے لیے بعینہٖ وہی تصوّر پایا جاتا ہے، حالانکہ امر واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام نے شخصی ملکیّت کا حق تو ضرور دیا ہے مگر نظامِ سرمایہ داری کی طرح یہ حق بالکل آزاد اور خود مختار نہیں ہے بلکہ اس پر کچھ حدود و قیود عائد کی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے گوناگوں مصالح کے تحت متعین فرما دی ہیں۔ گویا اسلام میں شخصی ملکیّت کا حق اللہ کے اذن کا پابند ہے۔

زیرِ بحث مسئلہ میں بھی صورتِ حال یہی ہے کہ اسلام اس بات کا تو حق دیتا ہے کہ عام حالات میں ایک شخص اپنے مال کو جس طرح چاہے، جب چاہے اور جس قیمت پر چاہے فروخت کرے مگر اسلام کسی کو اپنی ملکیّت میں ایسے کسی تصرف کا حق نہیں دیتا جس سے دوسرے اشخاص یا بحیثیت مجموعی پورے معاشرہ کو نقصان اور ضرر پہنچے اسلام تو اس سلسلہ میں اس قدر محتاط رویہ رکھتا ہے کہ صرف دانستہ نقصان پہنچانا تو درکنار اگر کوئی دوسروں کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ بھی رکھتا ہو تب بھی اگر اس کے کسی مالکانہ تصرف سے دوسرے افراد پر یا معاشرہ پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہوں تو اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ وہ شخص اپنے تصرفات میں اس طرح ترمیم کرے کہ دوسرے اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ تمام وہ عوامل جن کے ذریعہ مصنوعی گرانی پیدا

ہوتی ہے اسی اصول کے تحت آتے ہیں اور اسی بنا پر اسلام احتکار، اتلافِ مال، تبخیسِ اشیار اور استحصال بے جا وغیرہ کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔

مصنوعی گرانی کے سدِ باب کیلئے اسلام کا طریقۂ کار

گرانی کے ان مصنوعی عوامل پر فرداً فرداً اسلام کے نقطۂ نظر کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے اس سلسلہ میں ایک اصولی بات پہلے ہی مرحلہ میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ وہ یہ کہ جہاں تک بازار کی فطری روش کا تعلق ہے اسلام اس بات کی پوری کوشش کرتا ہے کہ اسے آزادی سے اپنا عمل جاری رکھنے کے ہر ممکن مواقع بہم پہنچائے جاتے رہیں اور بازار میں رسد اور طلب کا توازن ہر حالت میں برقرار رہے۔ اسلامی ریاست جہاں تک بھی ہو سکے رسد اور طلب کے فطری تعامل میں مداخلت نہ کرے۔ اگر قدرتی عوامل ایسے پیدا ہو جائیں کہ رسد اور طلب کا توازن بگڑ جائے اور اس کے نتیجے میں اشیار گراں ہو جائیں تو اسلامی ریاست کے لیے ضروری کہ وہ تسعیر (Price Control) وغیرہ کے قانونی ذرائع استعمال کرنے کے بجائے اس قسم کے اسباب مہیا کرنے کی کوشش کرے جس سے رسد اور طلب میں پھر توازن پیدا ہو جائے اور اشیار کی قیمتیں اپنے معیار پر واپس آجائیں۔ اس کے برخلاف اگر اشیار کے گراں ہونے کا سبب غیر قدرتی عوامل ہوں مثلاً تاجروں نے زیادہ نفع کے حصول کی خاطر احتکار (Hoarding) شروع کر دی ہو یا بعض صنعتکار اپنی مصنوعات کی قیمت بڑھانے کے لیے بازار میں اس کی رسد کم کرنے کی خاطر ان مصنوعات کے کچھ حصے کو ضائع کر دینے کو ترجیح دینے لگے ہوں

یا اسی قسم کے اور دوسرے ایسے ہتھکنڈے استعمال ہو رہے ہوں جن کی بنا پر رسد اور طلب کا توازن بگڑ رہا ہو اور اشیاء گراں ہو رہی ہوں تو اسلامی ریاست کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان غیر قدرتی عوامل کا سختی سے سدِباب کرے اور ایسے قوانین بنائے جن کے ذریعہ ان مصنوعی عوامل کے پیدا ہونے کے امکانات ہی ختم ہو جائیں۔

قدرتی عوامل کے تحت اشیاء کی گرانی

دراصل اشیاء کی گرانی کا سبب اگر قدرتی عوامل ہوں تو اس صورت میں قانونی وسائل کے سہارے اشیاء کی قیمتوں کو نیچے لانا اور تاجروں کو سستے داموں مال فروخت کرنے پر مجبور کرنا تاجروں پر ظلم کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ہی ایک موقعہ پر جب مدینہ میں قحط پڑا اصحابؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارزاں نرخ مقرر کرنے کی درخواست کی تو آپؐ نے انکار فرما دیا اور اسے ظلم سے تعبیر کیا۔

اَصَابَ النَّاسَ سِنَةٌ فَقَالُوا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ سَعِّرْ لَنَا قَالَ لَا یَسْئَلُنِیَ اللّٰہُ عَنْ سُنَّةٍ اَحْدَثْتُھَا عَلَیْکُمْ لَمْ یَاْمُرْنِیْ بِھَا وَلٰکِنَّ سَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ۔

(طبرانی۔ کبیر بحوالہ کنز العمال حدیث ۱۰۶۳۱)

وہ لوگ قحط کے شکار ہوئے تو انہوں نے کہا اے رسول خدا (صلعم) ہمارے لیے نرخ مقرر کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا نہیں اللہ مجھ سے ایسے طریقہ کے بارے میں جواب طلب کرے گا جس کا اس نے مجھے حکم نہ دیا

ہو اور میں اُسے اپنی طرف سے اختراع کر لوں بلکہ تم اللہ سے اسکے فضل کے لیے دعا کرو۔"

اسی طرح ابو داؤد کتاب البیوع میں تسعیر کے باب کے تحت ایک روایت حضرت انسؓ سے لاتے ہیں۔

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ النَّاسُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ غَلَا السِّعْرُ فَسَعِّرْ لَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّزَّاقُ وَاِنِّیْ لَاَرْجُوْا اَنْ اَلْقَی اللّٰہَ وَلَیْسَ اَحَدٌ مِنْکُمْ یُطَالِبُنِیْ بِمَظْلَمَۃٍ فِیْ دَمٍ وَّلَا مَالٍ

"انسؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے یہ کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ نرخ گراں ہو گئے ہیں لہٰذا آپ ہمارے لیے نرخ مقرر کر دیجیے تو رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا کہ اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا، (اشیاء کی پیداوار میں) تنگی پیدا کرنے والا، فراخی پیدا کرنے والا اور رزق عطا کرنے والا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہوں کہ تم میں سے کوئی مجھ سے کسی ظلم کا بدلہ طلب کرنے والا نہ ہو جو جان یا مال کے سلسلہ میں کیا گیا ہو۔"

گو یہ روایت صرف اتنا بتاتی ہے کہ نرخ گراں ہو گئے تھے اس گرانی کا سبب نہیں بتاتی لیکن اس قسم کی روایت کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ گرانی کی وجہ یہ تھی کہ غلہ باہر سے ہی گراں نرخ پر آ رہا تھا۔ یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ

مدینہ میں غذائی اجناس زیادہ تر باہر سے درآمد کی جاتی تھیں ظاہر ہے جب غلہ باہر ہی سے گراں آرہا ہو تو مقامی تاجروں کو کسی کمتر نرخ کا پابند بنا دینا صریحاً ظلم ہوتا اسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے انکار فرما دیا اور اللہ تعالیٰ کے قبض وبسط کا ذکر کر کے اشارہ فرما دیا کہ گرانی کے یہ قدرتی عوامل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب چاہے ان کو تمہارے موافق بنا دے اور جب چاہے ان کو تمہارے خلاف حرکت میں لے آئے۔ چنانچہ قدرتی عوامل کے تحت جو گرانی پیدا ہوگی اس کے تدارک کی یہ صورت قطعاً غلط ہوگی کہ قانونی دباؤ کے سہارے ارزانی کی کوشش کی جائے بلکہ اس کا صحیح اور عادل طریقہ یہ ہے کہ ان حقیقی اسباب کی درستگی کی طرف توجہ دی جائے جو گرانی کا اصل موجب ہیں۔ اسلام کے قرن اول میں ایسی بہت سی نظیریں موجود ہیں کہ جب قدرتی عوامل کے تحت پیدا ہونے والی گرانی کو دور کرنے کے لیے اسلامی ریاست نے تسعیر وغیرہ کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اشیاء کی رسد کو درست کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ۱۸ھ میں جب مدینہ میں قلت پیداوار کی بنا پر زبردست قحط پڑا تو حضرت عمرؓ نے غذائی اشیاء کی رسد بحال کرنے کے لیے مصر اور شام جیسے دور دراز ممالک سے غلہ، آٹا، چربی اور تیل وغیرہ اونٹوں پر بار کرا کرا کر منگوایا۔ ہزاروں کی تعداد میں مویشی اور اونٹ بھی باہر سے منگوائے گئے۔

غیر قدرتی عوامل کی بنا پر گرانی

غرض اسلام کاروباری افراد کو اس حق میں کوئی مداخلت نہیں کرتا کہ وہ اپنے اموال جب چاہیں اور جس قیمت پر چاہیں اور جس قیمت پر چاہیں فروخت

کریں تو وہ اسی صورت میں ہے جب کہ اشیار کی گرانی یا ارزانی قدرتی عوامل کے
تحت رو پذیر ہو رہی ہو۔ کاروبار کی فطری روش کی حد تک واقعتاً اسلام کسی
پابندی کو روا نہیں سمجھتا مگر جہاں معاملہ غیر قدرتی عوامل کے تحت پیدا ہونے
والی گرانی کا ہو وہاں اسلام ان غیر قدرتی عوامل کے تدارک کے لیے نہ
صرف یہ کہ سخت سے سخت قانونی قدغنیں لگاتا ہے بلکہ اس بات کا پورا
اہتمام کرتا ہے کہ ابتدار ہی سے اس قسم کے معاشی قوانین بنائے جائیں جن
سے یہ غیر قدرتی عوامل بروئے کار ہی نہ آسکیں۔

گرانی کے غیر قدرتی اور مصنوعی عوامل کے بارے میں اسلام کے اس
متذکرہ اصولی نقطۂ نظر کی وضاحت کے بعد اب ہم ان عوامل کو ایک ایک
کر کے لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اسلام میں ان کی کیا حیثیت ہے اور اسلامی
نظامِ معیشت میں ابتدا ہی سے ان کے تدارک کا کیا اہتمام کیا گیا ہے۔

اِتلافِ مال

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے اتلافِ مال کو لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم شروع
میں ذکر کر آئے ہیں اشیار کی معیاری قیمت کا انحصار اشیار کی رسد اور طلب کے
متوازن رہنے پر ہے، اگر رسد گھٹ جائے تو اشیار کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں۔
سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں کاروباری افراد جب اپنے اموال و موضوعات
کی فروخت پر اپنے نفع کی شرح بڑھانا چاہتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان اشیار
کی رسد گھٹ جائے تاکہ ان کی قیمتیں چڑھ جائیں۔ عام طور پر اس مقصد کے حصول
کے لیے اشیار کے فاضل حصے کو محفوظ کر لیا جاتا ہے کوشش کی جاتی ہے کہ

بیرونی منڈیوں میں سستے داموں کھپ جاتے لیکن بعض اشیاء اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں زیادہ عرصہ تک محفوظ رکھا جا سکے، مثلاً ترکاری یا پھل وغیرہ یا بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو ذخیرہ کرنے کے اخراجات اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ ان کو گوارا کرنا نفع بخش نہیں ہوتا۔ اس لیے کاروباری افراد اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان اشیاء کو ضائع کر دیا جائے تاکہ منڈی میں ان اشیاء کی رسد گھٹ جائے اور پھر وہ منہ مانگے داموں پر فروخت ہو سکیں۔

ظاہر نظر میں اموالِ تجارت کا کاروباری افراد کے اپنے ہاتھوں ضائع ہو جانا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے اور ایک عام ذہن یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا کہ کسی کاروباری آدمی کا دماغ اس قدر بھی خراب ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مال کو اپنے ہی ہاتھوں ضائع کر دے، مگر سرمایہ دارانہ آزاد معیشت میں یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں ہے۔ اس بات کو ایک عام آدمی کے ذہن کے ذرا قریب لانے کے لیے تھوڑی سی وضاحت درکار ہے۔ قانونِ رسد و طلب کا تقاضا یہ ہے کہ جس مخصوص قیمت پر کسی چیز کی ایک مقدار طلب کی جا رہی ہے اس سے زیادہ قیمت پر اس سے کم مقدار اور کم تر قیمت پر زیادہ مقدار طلب کی جائے۔ فرض کیجیے۔ آج ایک خاص نرخ پر ایک چیز کی ایک خاص مقدار کی طلب منڈی میں پائی جاتی ہے اب اگر اس شے کی رسد میں اضافہ کر دیا جائے تو یہ اضافہ شدہ مقدار اسی وقت فروخت ہو سکے گی جبکہ نرخ کچھ کم کر دیا جائے۔ رسد کے اضافہ کے ساتھ نرخ کم ہوتا جائے گا کیونکہ

حالات طلب بر قرار ہیں۔ اگر اشیاء کی قیمت کم نہ کی جائے گی تو اس کے نتیجے میں اُن اشیاء کا کچھ حصّہ فروخت ہونے سے رہ جائے گا۔ جن لوگوں کا مال فروخت نہ ہوگا وہ نرخ کم کر کے اسے بیچنے کی کوشش کریں گے اور بالآخر رسد بڑھیگی اور اس کا اثر قیمت میں کمی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اب یہ نرخ کا گرجانا کاروباری افراد کو کسی طرح پسند نہیں ہوتا۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ بازار کا نرخ جتنی آسانی سے گِر سکتا ہے اتنی آسانی سے دوبارہ اپنی سطح پر نہیں لایا جاسکتا ہے، دوسرے نرخ کا گرنا اس لیے بھی ناپسند ہے کہ اس سے کاروباری افراد کے منافع میں کمی واقع ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر مال کی لاگت میں متناسب کمی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کاروباری آدمی یہ دیکھتا ہے کہ مال کے ایک حصّہ کو تلف کر دینے سے بقیہ مال کی قیمت چڑھ جائے گی اور اس کے مجموعی نفع میں اضافہ ہوجائے گا تو اس کی خود غرضی اسے مال کو تلف کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شے کی کم مقدار کو اونچے داموں فروخت کرنے سے کاروباریوں کا مجموعی نفع اس شے کو کم داموں پر زیادہ مقدار میں فروخت کرنے کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

اتلاف مال اور سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اس طرح کے تلفِ مال کو جرم قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اس کو مال کے مالک کا جائز حق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ مشہور مغربی محقق جان آسٹن کہتا ہے۔

"غیر منقول املاک یا مویشی وغیرہ میں مطلق ملکیت کی رو سے اپنی ملکیت کے تباہ کر دینے یا ضائع کر دینے کا حق حاصل ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس تباہی میں کسی دوسرے فرد پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔"

"اگر میں اپنے مکان کا مالک ہوں تو میں چاہوں تو اُسے تباہ کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے اس کو اس طرح ہرگز تباہ نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے میرے پڑوسیوں کو نقصان پہنچے۔"

دراصل نظامِ سرمایہ داری نے ملکیت کا جو بے قید اور خود مختار تصور دیا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ فرد کے لیے اپنے مال کو ضائع کر دینے کا حق بھی تسلیم کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے حامل ممالک میں اس قسم کے اتلافِ مال کو قانونی تحفظ حاصل ہے چنانچہ گرانی نرخ کے حصول کی خاطر بڑی مقدار میں مفید اشیاء کو ضائع کر دینے کی متعدد مثالیں سرمایہ دار ممالک میں ملتی ہیں۔ برازیل میں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان بیس لاکھ ٹن کافی اسی مقصد کے پیشِ نظر تلف کی گئی۔ کیلیفورنیا میں سنگتروں کی ایک بڑی مقدار مختلف طریقوں سے تلف کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح بعض منڈیوں میں کیلے کثیر تعداد میں ضائع کر دیئے جاتے ہیں تاکہ ان کا نرخ ایک خاص سطح سے نیچے نہ گرنے پائے۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جاپان میں سات لاکھ بیس ہزار بہترین موتی صرف اس لیے آگ کی نذر کر دیئے گئے کہ رسد میں اضافہ کے سبب ان قیمت گرتی چلی جا رہی تھی۔ غرض اس قسم کی بہت سی مثالیں سرمایہ دار ممالک میں عام ہیں۔

اتلافِ مال اسلام کی نظر میں

اس کے برعکس اسلامی تصورِ ملکیت کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ فرد کو اپنی ملکیت کے فضول ضائع کرنے کا حق نہ دیا جائے۔ اسلام نے ملکیت کا جو تصور دیا ہے اس کی رو سے ہر قسم کی اشیاء اصلاً اللہ کی پیدا کردہ اور اس کی ملکیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو عطا کر دے وہ ان کا مالک تو بن جاتا ہے اور اللہ ان میں تصرف و انتقال کے حقوق بھی اس کو عطا کر دیتا ہے مگر یہ تمام حقوق اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے مصالح کے پابند ہوتے ہیں۔ گویا انسان کو ہر قسم کی اشیاء پر ملکیت تو حاصل ہے مگر آزاد اور مختار نہیں بلکہ اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود اس ملکیت پر عائد ہیں۔ اس لحاظ سے انسان کی ملکیت فی الحقیقت مالک حقیقی کی امانت ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ امین کو امانت کے ضائع کر دینے کا حق نہیں۔

دراصل اس سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مال و املاک وغیرہ بنی نوع انسان کی زلیست کا سہارا ہیں۔ اس سہارے کو غلط طریقہ سے ضائع کرنا فی الواقعی پوری انسانیت کی حق تلفی اور نسلِ انسانی پر صریح ظلم کے ہم معنی ہے۔ قرآن کریم نے اسی لیے اتلافِ مال کو فساد سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ـ

(البقرۃ-۲۰۵)

"اور جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں اس لیے دوڑ دھوپ کرتا

پھرتا ہے کہ فساد پھیلائے کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کر دے حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا "۔

ایک دوسری جگہ پر اسی طرح ارشادِ ربانی ہے :۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا

(الاعراف: ۸۵)

" اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے "۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر صراحتاً مال کو ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی۔ امام بخاری کتاب الرقاق میں حضرت مغیرہؓ سے ایک روایت لائے ہیں آپ فرماتے ہیں۔

قَالَ وَكَانَ يَنْهٰى عَنْ قِيْلَ وَقَالَ وَكَثْرَةِ السُّؤَالِ وَاِضَاعَةِ الْمَالِ وَمَنْعٍ وَّهَاتِ وَعُقُوْقِ الْاُمَّهَاتِ وَوَاْدِ الْبَنَاتِ۔

"(راوی نے) کہا کہ آپؐ قیل و قال کرنے، بہت زیادہ سوالات دریافت کرنے، مال کو ضائع کرنے خود نہ دینے اور دوسروں سے مانگنے، ماں کی نافرمانی کرنے اور بچّوں کو زندہ دفن کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے"۔

اسی طرح کتاب الزکوٰۃ میں بھی حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے ہی امام بخاری ایک روایت لائے ہیں۔ اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے ہی صریح الفاظ میں اتلافِ مال سے منع فرمایا ہے۔ حضرت مغیرہؓ فرماتے ہیں :۔

سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ کَرِہَ لَکُمْ ثَلَاثًا قِیْلَ وَقَالَ وَاِضَاعَةَ الْمَالِ وَکَثْرَةَ السُّوَالِ -

"میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو ناپسند فرمایا ہے قیل وقال کرنا ، مال ضائع کرنا اور کثرت سے سوال کرنا"

مفید اشیاء کی تباہی دراصل اسلام کی نظر میں پوری انسانیت کا مشترک نقصان ہے - یہی وجہ ہے کہ دشمنوں سے جنگ کی حالت میں بھی تلفِ مال سے حتی الامکان پرہیز کو اسلام ضروری قرار دیتا ہے. حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ فرمائیں تو حضرت یزید بن ابی سفیانؓ سپہ سالار افواج کو نصیحت فرمائی -

اِنِّیْ مُوْصِیْكَ بِعَشْرٍ لَا تَقْتُلَنَّ امْرَأَةً وَلَا صَبِیًّا وَلَا کَبِیْرًا وَّ لَا تَقْطَعَنَّ شَجَرًا مُثْمِرًا وَلَا تُخَرِّبَنَّ عَامِرًا وَلَا تَعْقِرَنَّ شَاةً وَلَا بَعِیْرًا اِلَّا لِأَکْلِہٖ وَلَا تُحْرِقَنَّ نَخْلًا وَلَا تُغَرِّقَنَّہٗ وَلَا تَغْلُلْ وَلَا تَجْبُنْ :- (موطا امام مالک : کتاب الاحکام الخلافہ باب النہی عن الغلول والغدر)

"میں تمہیں دس باتوں کی تلقین کرتا ہوں - کسی عورت ، بچے یا بوڑھے کو نہ قتل کرنا ، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا ، کسی آباد زمین کو ویران نہ

کرنا، کسی بکری یا اونٹ کو بجز غذائی ضرورت کے ذبح نہ کرنا، کسی نخلستان کو جلا کر یا پانی میں غرق کر کے برباد نہ کرنا، مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور بزدلی نہ دکھانا۔"

غرض اسلام میں اتلاف مال کی ممانعت ایک ثابت شدہ اصول ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت میں کسی تاجر یا صنعت کار کو قیمت چڑھانے کے لیے پیداوار کا کوئی حصہ ضائع کرنے کی اجازت نہ ہو گی بلکہ اتلافِ مال کو اسلامی ریاست میں ایک قابلِ تعزیر جرم سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ فی الحقیقت پورے معاشرے پر ظلم کے مترادف ہے۔

اس سلسلہ میں یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ بعض حالات میں قیمتوں میں کمی کا رجحان اتنا شدید ہوتا ہے کہ اتلافِ مال کا ذریعہ اختیار نہ کرنا کاروباریوں کے لیے شدید خسارہ کا باعث بنتا ہے۔ اس قدر شدید کہ یہ کاروباری افراد کا خسارہ پوری ملکی معیشت کے فساد کا باعث ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں تلفِ مال کی قانونی ممانعت معیشت کو اصلاح کے بجائے فساد کے راستہ پر ڈال دے گی۔ لیکن اس قسم کے اعتراضات صرف اسی وقت تک ہیں جب تک تلفِ مال کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ اوّل تو معاشی تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایسی صورتِ حال بہت ہی استثنائی حالات میں پیش آتی ہے مگر فرض کیجیے کہ رسد میں غیر معمولی اضافہ کے سبب قیمتوں میں کمی کا رجحان اتنا شدید ہو ہی جاتا ہے تو تلفِ مال کی قانونی ممانعت کاروباری افراد کو خود بخود مجبور کرے گی وہ خسارہ سے بچنے کی کوئی اور راہ نکالیں۔ باہمی تعاون اور ریاست کی مدد سے ایسی

بہت سی صورتیں نکالی جا سکتی ہیں جو نہ صرف ایک طرف قدرت کی عطا کردہ بیش بہا نعمتوں کو تباہ ہونے سے بچالیں بلکہ دوسری طرف کاروباری افراد کے ناگزیر مفادات کا بھی پورا پورا تحفظ کریں۔ مثال کے طور پر ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ کاروباری افراد باہمی معاہدہ یا ریاست کی مدد سے اشیاء کا ایسا نرخ مقرر کر لیں کہ جس سے مجموعی فروخت پر کاروباریوں کو اپنی اشیاء کی لاگت بھی واپس مل جائے اور کچھ منافع بھی بچ رہے۔ جو اشیاء متعینہ قیمت پر فروخت نہ ہو سکیں انہیں ریاست کے حوالہ کر دیا جائے یا رفاہِ عامہ کے اداروں کو دے دیا جائے جو انہیں ضرورتمندوں کے درمیان اس طرح تقسیم کر دیں یا ملک سے باہر کی منڈیوں میں اس طور پر فروخت کر دیں کہ اس سے اندرون ملک منڈی کی طلب پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ یہ تو بہر حال ایک مثال ہے۔ اتلاف مال کا دروازہ ایک مرتبہ بند ہو جائے تو خود بخود ایسی بہت سی متبادل شکلیں سامنے آئیں گی کہ مال کا ضیاع بھی نہ ہو گا۔ اور کاروباری حقوق کا تحفظ بھی بدرجۂ اتم حاصل رہے گا۔

احتکار

اتلافِ مال کے بعد اب ہم گرانی کے ایک دوسرے مصنوعی عامل احتکار سے بحث کرتے ہیں۔ کاروباری افراد منڈی میں اپنے اموال کو مہنگے داموں فروخت کرنے کی خاطر ان کی رسد گھٹانے کے جو طریقے اختیار کرتے ان میں سے ایک احتکار (Hoarding) بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے وہ اشیاء جو اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں زیادہ دیر تک محفوظ

رکھا جا سکے ان کو تو کاروباری افراد رسد گھٹانے کی خاطر ضائع ہی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں مگر ایسی اشیار جنہیں کافی عرصہ تک محفوظ رکھا جا سکتا ہے یا جن کو ذخیرہ کرنے پر کچھ زیادہ اخراجات برداشت کرنے نہیں پڑتے ان کو ضائع کرنے کے بجائے ذخیرہ کر لیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اس موقعہ پر زیادہ استعمال کیا جاتا ہے جب قدرتی عوامل کے تحت کسی شے کی رسد میں کمی واقع ہو رہی ہو اور اس کے سبب اس شے کی قیمت چڑھ رہی ہو۔ ایسے وقت خود غرض کاروباری بڑھتی ہوئی قیمتوں کو اور زیادہ بڑھانے اور قلتِ رسد سے پیدا ہونے والی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر من مانا زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے اس شے کو منڈی سے اٹھا کر گوداموں میں ڈال دیتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں کہ نرخ گراں سے گراں تر ہوتے جائیں اور منڈی میں اس شے کی نایابی کی بنا پر خریدار اسے ہر قیمت پر اٹھانے کے لیے مجبور ہو جائیں۔

احتکار اور چور بازاری

احتکار کے مضر اثرات کی شدت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کاروباری افراد ذخیرہ شدہ شے کو کھلے بازار میں لانے کے بجائے چور بازاری کے ذریعہ کئی گنا زیادہ قیمت پر فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہوتا دراصل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے حامل ممالک میں جب کبھی کسی قدرتی عامل کے تحت گرانی پیدا ہوتی ہے تو بجائے اس کے کہ اس عامل کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے تسعیر (Price Control) وغیرہ کے ذریعہ ایسے اقدامات کیے جاتے ہیں کہ ان کی بنا پر نہ صرف یہ کہ تاجر لوگ احتکار

پر مجبور ہو جاتے ہیں بلکہ ان میں چور بازاری کا رحجان پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ قدرتی عوامل کے تحت اگر اشیاء گراں ہو جائیں تو ان کے ارزاں نرخ متعین کرنا ان اشیاء کے پیدا کرنے والوں اور فروخت کرنے والوں پر ظلم کے ہم معنی ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی کاروباری فرد کسی بھی حالت میں اس پر تیار نہیں ہوگا کہ اپنے مال کو ایسے داموں فروخت کر دے جو اس کی اصل لاگت سے بھی کم ہوں۔ اُسے اگر قانونی دباؤ کے تحت ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے گا تو وہ خسارہ سے بچنے کے لیے فطری طور پر یہی کرے گا کہ کھلی منڈی میں فروخت بند کر دے اور چوری چھپے ضرورتمندوں کے ہاتھوں خاطر خواہ نفع پر بیچے۔ تسعیر کا طریقہ تو اسی وقت درست ہے اور مفید بھی اسی وقت ہوتا ہے جب گرانی قدرتی عوامل کے تحت رونما نہ ہوئی ہو بلکہ خود غرض اور مفاد پرست عناصر نے مصنوعی طور پر رسد میں کمی کر کے نرخ گراں کرنے کی کوشش کی ہو۔

غرض احتکار ایک ایسی معاشی بیماری ہے جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خود اس کی اپنی پیدا کردہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کے پاس اس بیماری کا کوئی مؤثر علاج نہیں ۔

احتکار کے سد باب کے لیے اسلام کا طریقۂ کار

اس کے برخلاف جب احتکار کے مسئلہ پر ہم اسلام نے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اس مسئلہ کو سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے دیتا احتکار خواہ عام حالات میں محض نفع کمانے کی خاطر کیا جائے خواہ قدرتی قلت

رسد کے زمانہ میں گرانی کو شدید سے شدید تر بنانا اور موقع سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو، اسلام دونوں صورتوں میں احتکار کو سخت ناپسندیدہ قرار دیتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

مَنِ احْتَكَرَ يُرِيدُ اَنْ يَتَغَالٰى بِهَا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ فَهُوَ خَاطِئٌ وَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ۔

(مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۱۲)

"جو مسلمانوں کے لیے نرخ گراں کرنے کی غرض سے ذخیرہ اندوزی کرے وہ غلط کار ہے اور اللہ اس سے بری ہے"۔

دراصل اشیائے تجارت کی گرانی کی خاطر احتکار کرنے والا صرف یہی نہیں کہ معاشرے کے دوسرے افراد کو نقصان پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ اس طرح وہ پوری ملکی معیشت کو فساد کی راہ پر لگاتا ہے اور بازار کی فطری روش میں خلل انداز ہو کر مجموعی طور پر پورے معاشرہ کو مصائب سے دوچار کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا۔

..... فَقَالَ مَعْقِلُ ابْنُ يَسَارٍ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ دَخَلَ فِيْ شَيْءٍ مِنْ اِسْعَارِ الْمُسْلِمِيْنَ لِيُغْلِيَهُ عَلَيْهِمْ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اَنْ يُقْعِدَهُ فِيْ مُعْظَمِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ؛- (مسند ابوداؤد الطیالسی ص ۲۵)

"معقل ابن یسار نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کہ اسے گراں کر دے تو اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن اُسے زبردست آگ میں جھونک دے"۔

احتکار کا سدِ باب کرنے کے اسلام صرف اخلاقی دباؤ ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ قانونی وسائل کو بھی ضرورت پڑنے پر پوری طرح استعمال میں لاتا ہے۔ اگر ایک طرف وہ اخلاقی دباؤ کے استعمال کے طور پر کاروباری افراد کو ایک بالاتر ہستی کے حضور جوابدہی کا احساس دلا کر ان کو اس بات کا شعور عطا کرتا ہے کہ خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے تمام انسان ایک خاندان کے افراد ہیں اس لحاظ سے ان سب کے مقاصد مشترک ہیں تو دوسری طرف وہ اسلامی ریاست کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ معاشرہ میں سے چند بہترین افراد کو منتخب کر کے احتساب و نگرانی کا ایک باقاعدہ نظم قائم کرے جس کا کام یہ ہو کہ جہاں جہاں جسے بھی احتکار کے مواقع حاصل ہوں اس پر کڑی نگاہ رکھے اور جو فرد یا گروہ حرص و ہوس کا شکار ہو کر احتکار کا مرتکب ہو اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ یہ نظم احتکار کرنے والوں کو اپنے مال بازار میں لانے پر مجبور کر سکتا ہے اور اگر چور بازاری کا انسداد ممکن ہو تو اسلامی ریاست ان احتساب کے ذمہ دار حکام کو اشیاء کے نرخ متعین کر دینے کا اختیار بھی دے سکتی ہے۔

احتکار کے سدِ باب کے لیے تسعیر کا استعمال

اشیاء کے نرخ مقرر کرنے کے سلسلہ میں یہ وضاحت اوپر گزر چکی ہے کہ اسلام اس تعیین نرخ کے طریقہ کو اس صورت میں نہ صرف ناجائز بلکہ ظلم کے مترادف قرار دیتا ہے جب کہ گرانی قدرتی عوامل کے تحت رونما پذیر ہوئی ہو۔ لیکن گرانی کی وجہ اگر احتکار وغیرہ جیسے مصنوعی عوامل ہوں تو اس صورت میں اگر ذخیروں کی دریافت اور انکو بازار میں لانے کے لیے راست اقدام دشوار یا مصالح کے خلاف ہو تو اسلامی ریاست کو پورا اختیار ہے کہ وہ اشیار کے نرخ متعین کر دے اور تاجروں کو متعینہ قیمت پر اپنے مال فروخت کرنے پر مجبور کرے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو مناسب سزا دینے کا اختیار بھی اسلامی ریاست کو حاصل ہے چنانچہ اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:۔

"سلطان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ لوگوں کو متعین قیمتوں کا پابند بنائے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قیمت نہ مقرر کرو کیونکہ اللہ ہی قیمت مقرر کرنے والا، تنگی پیدا کرنے والا، فراخی پیدا کرنے والا، رزق عطا کرنے والا ہے" اور اس لیے کہ قیمت (بتانا) عقد بیع کرنیوالے کا حق ہے لہٰذا اس کی تعیین وہی کر سکتا ہے۔ پس امام کو اس کے حق میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے بجز اس صورت حال کے جب کہ ضرر عامہ کا دفعیہ اس کا متقاضی ہو جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

جب یہ مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ احتکار کرنیوالے

کو حکم دے گا کہ اس کی اور اس کے گھر والوں کی غذائی ضروریات جس کا اندازہ فراخی کے ساتھ کیا جائے گا، جو کچھ فاضل ہو اُسے فروخت کر دے اور قاضی اسے احتکار کرنے سے منع کرے گا اگر دوبارہ اسی تاجر کو اس کے سامنے (اسی جرم میں) پیش کیا جائے تو وہ اسے قید کر دے گا اور ایسی سزا دے گا جو اس کو غلط کاری سے باز رکھنے کے لیے مناسب نظر آئے تاکہ عوام کی ضرر رسانی ختم ہو۔

اگر غلّہ کے تاجر من مانی قیمتیں وصول کرتے ہوں اور معقول قیمتوں سے زائد دام وصول کرتے ہوں اور قاضی نرخ مقرر کرنے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہ کر سکتا ہو تو ایسی صورت میں اہل رائے اور صاحب بصیرت افراد کے مشورہ سے قیمتیں مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں ۔"

(ہدایہ جلد ۴ - باب الکراہتیہ)

اس موضوع پر امام ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتاب 'الحسبہ فی الاسلام' میں سیر حاصل بحث کی ہے وہ بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ "جب لوگ معروف طریقہ کے مطابق اپنی تجارتی اشیار فروخت کر رہے ہوں ...... مگر نرخ اس شے کی قلّت یا آدمیوں کی کثرت کی بنا پر گراں ہو جائیں تو ...... خلق خدا کو اس بات کا پابند بنانا کہ وہ ان اشیار کو مقررہ قیمتوں ہی پر فروخت کریں ناحق جبر کرنا ہے "

البتہ احتکار کے تحت پیدا ہونے والی گرانی کی نوعیت جُدا ہے ۔امام صاحب

کی نظر میں "محتکر" خریدار عوام پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے اس وجہ سے صاحب امر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جب عوام کو ان اشیاء کی ضرورت ہو تو ایسے تاجر لوگوں کو اپنا مال قیمتِ مثل پر فروخت کرنے پر مجبور کرے۔

دراصل تسعیر کو جن مکاتب فقہ نے مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے ان کے استدلال کی مبنیٰ وہی احادیث ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود مطالبہ کے نرخ مقرر نہیں فرمائے اور ایسا کرنے کو ظلم سے تعبیر کیا لیکن ان احادیث کے صحیح فہم کے لیے اگر ان حالات کی تحقیق کی جائے جن میں یہ نرخ مقرر کرنے کا مطالبہ آپؐ سے کیا گیا تھا تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت گرانی کے اسباب قدرتی تھے۔ ان روایات سے یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ تاجروں کے احتکار اور بے جا نفع اندوزی کے سبب نرخ گراں ہوئے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں بھی نرخ مقرر کرنے سے انکار فرما دیا ہو۔ بھلا قدرتی گرانی کے حکم کو مصنوعی گرانی پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔

تبخیس اشیاء

بعض اوقات کاروباری افراد جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی اشیاء خاطر خواہ نفع نہیں کما رہی ہیں اور ساتھ ہی انہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان اشیاء کی قیمت بڑھا دینے سے ان کی مانگ کم ہو جائے گی تو وہ زیادہ نفع اندوزی کی خاطر یہ طریقہ بھی اختیار کرتے ہیں کہ ان اشیاء کا معیار گرا دیتے ہیں، کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان کی ظاہری شکل میں تو فرق نہ آئے مگر لاگت کم ہو جائے۔ ایک چیز کی تیاری میں وہ پہلے اگر اعلیٰ قسم کا خام مواد استعمال کرتے

تھے تو اب اس سے کمتر درجہ کا خام مواد استعمال کرنے لگتے ہیں یا اس کی مقدار کم کر دیتے ہیں۔ غرض کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اشیار کی تیاری کی لاگت کم ہو جائے تاکہ بغیر قیمت بڑھائے سابقہ قیمت پر ان اشیار کی فروخت پر نفع کی شرح بڑھ جائے۔

ظاہر ہے یہ طریقہ کاروباری افراد کے ذاتی فائدے کا باعث تو ہو جاتا ہے مگر بے چارے خریدار عوام کو یہ نقصان ہوتا ہے کہ وہ قیمت پوری دیتے ہیں اور چیز انہیں کم معیار کی ملتی ہے۔ گویا جتنی مقدار اور جتنے معیار کی چیز وہ پہلے ایک روپے میں حاصل کر لیتے تھے اس کے لیے انہیں اب ایک روپے سے زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

اسلام تبخیس اشیا کو فساد سے تعبیر کرتا ہے

نظامِ سرمایہ داری کے پاس اس بیماری کا بھی کوئی علاج نہیں کیونکہ اشیار کی تیاری کا کوئی معیار مقرر کرنا اس کی تنظیمِ معیشت کے فطری عمل میں دخل دینے کے مترادف ہے جو سرمایہ دارانہ تصورِ ملکیت کی رو سے غیر قانونی بھی ہے اور کاروبارِ معیشت کے لیے فساد کا باعث بھی لیکن اسلام کاروباری افراد کے اس عمل کو فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔ (ھود : ۸۵)

"اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔"

قرآن نے تخسیس کا لفظ بڑا جامع استعمال کیا ہے لوگوں کا نقصان صرف اسی صورت میں منحصر نہیں ہے کہ ناپ تول میں دھوکہ سے کمی کر دی جائے بلکہ وہ صورت بھی یقیناً تخسیس میں شامل ہے جو اوپر ذکر ہوئی کہ خریداروں سے قیمت تو پوری وصول کی جائے اور اس کے بدلے میں چیز وہ دی جائے جس کے معیار یا مقدار میں تخفیف کر دی گئی ہے۔ اسلام فرد کو اپنی ملکیت میں ایسے کسی تصرف کی اجازت نہیں دیتا جس سے دوسرے افراد یا بحیثیت مجموعی پورے معاشرہ کو نقصان پہنچے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من ضارّ ضارّ الله به ومن شاقّ شقّ الله علیه۔

(ترمذی ابواب البر والصلہ)

"جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے گا اس کو اللہ نقصان پہنچائے گا۔ اور جو کسی کو تکلیف دے گا۔ اس کو اللہ تکلیف میں مبتلا کرے گا۔"

دراصل تخسیس اشیاء کا طریقہ اختیار کرنا عام صارفین کو ضرر فاحش پہنچانے کے مترادف ہے اور اسلامی تصور ملکیت کی رو سے کسی فرد کو اپنی ملکیت میں ایسے کسی تصرف کا حق نہیں دیتا جس سے دوسروں کو ضرر فاحش پہنچے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تخسیس اشیاء کے عمل کو فساد سے تعبیر کیا جو اللہ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے:۔

ان الله لا یحب الفساد اور

ان الله لا یحب المفسدین۔

تخنیس اشیاء اور مبالغہ آمیز اشتہار بازی

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی محل نظر ہے وہ یہ کہ کاروباری افراد اشیاء کا معیار تو گھٹا دیتے ہیں۔ مگر وہ اسی گھٹیا مال کو بظاہر بلند معیار بنا کر سامنے لانے کے لیے جو غلط اور مبالغہ آمیز اشتہار بازی سے کام لیتے ہیں وہ اسلام کی نظر میں ایسا ہی ہے جیسے کسی عیب دار مال کو اچھا بتا کر فروخت کرنے کی کوشش کی جائے، دھوکہ اور فریب سے کام لے کر عیب دار مال کا عیب خریدار کو نہ بتایا جائے اور اس طرح اس مال کے پورے دام وصول کیے جائیں۔ اسلام اس حرکت کو مذموم سمجھتا ہے اور اسے ممنوع ٹھہراتا ہے۔ اسلام کے نزدیک فروخت کرنے والے کا فرض ہے کہ اگر اس کے مال میں کوئی عیب ہے تو خواہ خریدار اس سے مطالبہ کرے یا نہ کرے وہ خریداروں کو اس عیب سے مطلع کر دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرِ الْجُهَنِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ بَاعَ مِنْ أَخِيهِ بَيْعًا فِيهِ عَيْبٌ أَنْ يُبَيِّنَهُ لَهُ۔

(حاکم مستدرک جلد ۲ صفحہ ۸)

"عقبہؓ بن عامر جہنی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس نے اپنے بھائی کے ہاتھ کوئی ایسی چیز فروخت

کی ہو جس میں کوئی نقص ہو اور وہ اس کو اس نقص سے آگاہ نہ کر دے۔"

فی الحقیقت خریدار کو ہر اس عیب سے باخبر کر دینا ضروری ہے جس کے علم میں آجانے کے بعد اس کے خریداری کے ارادے میں کسی تبدیلی کا امکان ہو۔

تجنیس اشیاء کا تدارک

اب اس بارے میں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت میں اس تجنیس اشیاء کے عمل کے تدارک کا کیا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس سوال کے جواب کی تحقیق کے پیشِ نظر جب ہم فقہی ماخذ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ الحمد للہ ہمارے آئمہ سلف نے اس موضوع پر حسبہ (احتساب) کے عنوان کے تحت بڑی سیر حاصل بحث کی ہے[1] ان حضرات نے اپنے زمانہ کی مختلف صنعتوں، پیشوں اور کاروباری سرگرمیوں کا جائزہ لے کر مصنوعات کے مطلوبہ معیار اور ان کی تیاری کے صحیح

---

[1] تحقیق کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

(۱) امام غزالی، احیاء العلوم۔ (۲) الماوردی، الاحکام السلطانیہ باب ۲۰۔

(۳) ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ فصل فی احکام الحسبہ۔ (۴) ابن تیمیہ، الحسبہ فی الاسلام۔

(۵) ابنِ قیم، الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیۃ (۶) ابن الاخوۃ، معالم القربہ فی احکام الحسبہ۔

طریقہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ جہاں ان طریقوں کی خلاف ورزی نظر آئے یا اشیاء معیار مطلوبہ کے مطابق نہ تیار کی جاتی ہوں وہاں محتسب کے لیے لازم ہے کہ وہ مداخلت کرے۔ ائمۂ سلف نے اس بحث کے تحت اپنی تجاویز میں جہاں دھوکہ فریب اور ملاوٹ وغیرہ کھلے ہوئے اخلاقی یا فنّی مفاسد کی طرف توجہ دلائی ہے وہاں ایسے اقدامات بھی تجویز کیے ہیں جن کا منشا مصنوعات کے معیار کو بلند کرنا اور ان کی تیاری وفراہمی میں عمدگی اور سہولت پیدا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں صنعت وحرفت کی تقریباً ایک سو اصناف کا ذکر کر کے ہر پیشہ یا کاروبار کے سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کو کن حدود کا پابند ہونا چاہیئے اور اس کی مثبت ذمہ داریاں کیا ہیں۔ یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ ہر صنعت وحرفت پر اس سے گہری واقفیت رکھنے والے کسی دیندار اور دیانت دار فرد کو نگراں مقرر کر دینا چاہیئے۔ جو اس کاروبار میں حصّہ لینے والے افراد کو ہر قسم کی مضرت رسانی اور غلط روی سے باز رکھے۔ غرض آئمۂ کرام نے اپنی تصنیفات میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اگر ذرا جستجو سے کام لیا جائے تو جو باتیں ان حضرات نے آج سے صدیوں پہلے لکھی تھیں ان کو بڑی آسانی سے آج کے زمانہ کے مسائل پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

اجارہ داری

گرانی کے مصنوعی عوامل میں سے ایک عامل اجارہ داری بھی ہے۔ بعض اوقات زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی حرص میں کوئی ایک کاروباری فرد

یا چند کاروباری افراد مل کر بازار کی قوتوں پر غیر معمولی قابو حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ قابو مختلف طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کبھی چند کاروباری افراد مل کر اس قسم کا باہمی معاہدہ کر لیتے ہیں جس کے نتیجے میں مخصوص اشیاء کا کاروبار چند مخصوص ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور کبھی مسابقت (Competition) کے ذریعے حریفوں کو شکست دے کر کاروبار چھوڑنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور اس طرح مختلف اجارہ دارانہ ادارے قائم کیے جاتے ہیں۔ بالآخر ملک کا بیشتر پیداواری کاروبار چند بڑے بڑے اجارہ داروں کے ہاتھ میں سمٹ آتا ہے اور یہ خود غرض اجارہ دار ملکی معیشت کے سیاہ و سپید کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔ ان کی غیر معمولی معاشی طاقت ان کو بیش از بیش استحصال کے مواقع فراہم کرتی ہے اور وہ من مانے انداز میں اشیاء کو گراں سے گراں تر اور اپنے نفع کو زیادہ سے زیادہ بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

اجتماع کے مصالح کو افراد کے مصالح پر ترجیح ہے

اسلام ایسی صورتِ حال کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اسلام کے نزدیک ہر وہ معاہدہ جس کی بنیاد ظلم پر رکھی گئی ہو باطل ہے۔ دراصل اس سلسلہ میں اسلام کا مطمح نظر یہ اصول ہے کہ اجتماع کے مصالح کو بہر حال فرد کے مصالح پر ترجیح حاصل ہے اور اسی لیے اسلام انفرادی اعمال کو مناسب حدود کا پابند بناتا ہے تاکہ اجتماع کو انفرادی اعمال کے مضرت رساں اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول کے پیشِ نظر اپنے زمانہ کے حالات

اور اپنے معاشرہ کی ضروریات کے مطابق بعض کاروباری سرگرمیوں پر پابندی عائد کی تھی اور کاروباری معاملات کو چند آداب و ضوابط کا پابند بنایا تھا۔ تلقی جلب اور بیع الحاضر للبادی کی ممانعت میں یہی اصول کارفرما ہے۔ ہوشیار تاجر مدینے سے باہر جاکر دیہات سے آنے والے مالِ تجارت کو خرید لیتے تھے اور اسے شہر میں لاکر شہر کے نرخ پر فروخت کر دیتے تھے۔ دیہات سے مال لانے والے شہر کے نرخ سے ناواقفیت کی بنا پر مال کو سستے داموں ان تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ گو اس معاملہ پر دونوں فریق رضامند ہوتے تھے اور بظاہر اس میں کوئی شرعی قباحت نظر نہ آتی تھی لیکن اگر دیہات والوں کو شہر میں مال لاکر فروخت کرنے دیا جاتا تو شہر والوں کو بھی یہ چیزیں نسبتاً ارزاں ملتیں اور دیہات والے بھی نسبتاً زیادہ دام پاتے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقی جلب کی ممانعت کرکے درمیانی تاجروں کو نفع اندوزی سے روک دیا کیونکہ مدینہ والوں کا یہ عمل ان کو اجارہ داری کے مواقع مہیا کرتا تھا اور اجتماعی مفاد کے لیے نقصان کا باعث تھا جب کہ شریعت کی نگاہ میں اجتماع کے مصالح چند افراد کے مصالح سے زیادہ اہم ہیں۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر کے افراد کو دیہات والوں کا ایجنٹ بن کر ان کا مال فروخت کرنے (بیع الحاضر للبادی) سے منع فرمایا یہاں بھی وہی مصلحت پیشِ نظر ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔

اس سلسلہ میں ہم امام ابن تیمیہ کی تصنیف الحسبۃ فی الاسلام، سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے اس موضوع پر اسلام کے نقطۂ نظر کی مزید

وضاحت ہو جائے گی :-

٣ اسی اصول کی بنیاد پر متعدد فقہا مثلاً ابو حنیفہ اور ان کے رفقاء نے
ان بٹوارہ کرنے والوں کو باہم اشتراک کر کے انجمن بنا لینے سے منع
کیا ہے جو عوام کی غیر منقولہ املاک وغیرہ کے بٹوارہ کا کام اجرت
لے کر کرتے ہوں کیونکہ جب یہ اشتراک کر لیں گے تو چونکہ عوام ان
کی خدمات کے محتاج ہوں گے، یہ ان سے زیادہ اجرت طلب
کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ان تاجروں پر پابندی (ان بٹوارہ کرنے والوں
پر پابندی سے) زیادہ ضروری ہے جو باہم اشتراک کر کے یہ طے کر لیں
کہ مال کو اپنی طے کی ہوئی قیمتوں ہی پر فروخت کریں گے۔ یہی حکم ان
خریداروں پر پابندی عائد کرنے کا ہے جو خریدنے کے سلسلے میں باہم
اشتراک کر لیں تاکہ (فروخت کرنے والے) لوگوں کا مال ہضم کر سکیں۔ ان
پر بھی پابندی (مذکورہ بالا شکل میں پابندی سے) زیادہ ضروری ہے چنانچہ
جب افراد کا کوئی گروہ جو کسی خاص چیز کو خریدتا یا فروخت کرتا ہو باہم
یہ معاہدہ کرے کہ خریدنے میں زیادتی کرے گا اور اسے (خریدنے کی) معروف
قیمت مثل سے کم پر خریدے اور (بیچنے کی) معروف ثمن مثل سے زیادہ پر
فروخت کرے اور اس طرح اپنے خریدے ہوئے مال پر بیش از بیش نفع حاصل
کرے تو یہ طرزِ عمل اس سے بڑا ظلم ہے جو تلقی رکبان یا بیع الحاضر للبادی یا نجش
میں پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ باہم اس بات پر اشتراک کرتے ہیں کہ عوام پر
ظلم کریں گے تاکہ عوام ان کے مال کو ثمن مثل سے زیادہ پر خریدنے اور

(اس سے کم داموں پر) فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں - عوام ان اشیاء
کی خرید و فروخت پر مجبور ہیں - جس کی خرید و فروخت کے سارے عوام
ضرورت مند ہوں "

اس اقتباس سے جہاں کاروباری افراد کے لیے اس بات کی ممانعت ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال پر بیش از بیش نفع کے حصول کی خاطر بازار کی قوتوں پر اجارہ دارانہ قابو حاصل کرنے کی کوشش کریں وہاں خریداروں کے لیے بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ باہمی معاہدہ و اشتراک سے کوئی ایسا فیصلہ کریں جو کاروباری افراد کو اس امر پر مجبور کرنے کا باعث ہو کہ وہ اپنا مال خریداروں کے ہاتھ معروف قیمت سے کم پر بیچ دیں - دراصل شریعت کی نظر میں تو عامۃ الناس کی مصلحت ہے اور اس مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ فرد واحد کے مفاد پر جماعت کے مفاد کو ترجیح دی جائے خواہ معاملہ کاروباری افراد کا ہو یا خریداروں کا -

گرانی کے مصنوعی عوامل پر جو بحث اب تک ہم نے کی ہے اور ان کے بارہ میں اسلام کا موقف جو ہم نے پیش کیا ہے - اس کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ معترضین کے اس دعویٰ میں کوئی وزن رہ جاتا ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت کے پاس ایسا کوئی طریق کار نہیں جس کے ذریعہ ان عوامل کی روک تھام ہو سکے جو مصنوعی گرانی کا سبب بنتے ہیں -

آخر میں ایک بات خاص طور پر اس سلسلہ میں یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گرانی کے مصنوعی عوامل کی روک تھام کے لیے اسلام کی عائد کردہ جن پابندیوں

کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ بازاری قوتوں کے فطری عمل میں ریاست کی اس بیجا مداخلت کی فہرست میں ہرگز نہیں آتیں جو معیشت کے لیے فساد کا باعث ہوا کرتی ہے۔ دراصل صنعت و تجارت کو معاشرہ کا خادم بنا کر رکھنا اسلامی ریاست کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ ماضی میں ایک منفرد تاجر یا صنعت کار کے غلط طرزِ عمل سے معاشرے کو اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا آج اس صنعتی دور میں ممکن ہو گیا ہے۔ آج بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی اداروں میں لاکھوں خریداروں کو مال فراہم کرنے کے انتظامات کیے جاتے ہیں اور ایک کاروباری فرد کے فیصلے خلقِ خدا کی ایک کثیر تعداد کو فراہم کی جانے والی اشیاءِ ضرورت کی مقدار، ان کے معیار اور ان کے نرخ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن امور کا تعلق افراد کی ایک کثیر تعداد یا پورے اجتماع کے مصالح سے ہو ان کو انفرادی یا نجی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایسے تمام امور میں ریاست کو شریعت کے منشا کی تکمیل اور اجتماعی مصالح کے تحفظ کے لیے مداخلت کا اختیار دینا ہی عین انصاف ہے۔ ہر وہ پابندی جو عامۃ الناس کے مفادات کے تحفظ اور اجتماعی مصالح کی ترویج کے لیے عائد کی جائے نہ صرف یہ کہ اصولاً درست ہے بلکہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس پابندی کا عائد کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔
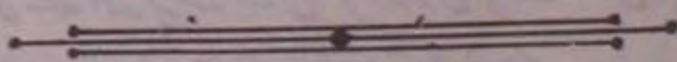
مزدور کا استحصال اور اس کا علاج

سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریوں میں سے ایک بیماری مزدور کا استحصال ہے۔ معاشی نظام کو فساد سے محفوظ رکھنے کے لیے دیگر بیماریوں کی طرح اس بیماری کا علاج بھی ضروری ہے۔ لیکن چونکہ بیماری کی نوعیت کا تعین کیے بغیر ہر قسم کا علاج صحت کے بجائے مرض کی زیادتی کا موجب ہوا کرتا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علاج تجویز کرنے سے پہلے مزدور کے استحصال کی صحیح نوعیت متعین کر لی جائے۔

مزدور کے استحصال کی صحیح نوعیت

مزدور کے استحصال کی ایک سیدھی سادھی شکل تو یہ ہے کہ پیداوار کے منافع میں سے جتنے حصہ پر مزدور کا حق بنتا ہے مزدور کو اس سے یا اس کے کسی جزو سے کسی نہ کسی طرح محروم کر دیا جائے اور دوسرے عوامل پیدائش کی نسبت سے حصہ رسدی کے طور پر جتنا منافع مزدور کی طرف منتقل ہونا چاہیئے تھا وہ منتقل نہ ہونے دیا جائے۔ اگر ایک سامان پر جس کی پیداوار میں چاروں عوامل پیدائش۔ زمین، سرمایہ، کاروباری جدوجہد اور مزدور کی محنت نے حصہ لیا ہے دو سو روپے منافع ہوتا ہے تو انصاف یہ ہے کہ اس میں جتنا حصہ مزدور کی محنت

کا ہے اس کے بقدر منافع مزدور کی طرف منتقل ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ ظلم ہے اور اسی کا نام استحصال مزدور ہے۔ مزدور کے استحصال کی یہ شکل تو وہ ہے جس کی طرف ہر سلیم الفطرت شخص کی عقل رہنمائی کرتی ہے لیکن اس استحصال کی تعریف میں اگر مبالغہ کر کے یہ کہا جائے کہ کل کا کل نفع مزدور کا حق ہے۔ دوسرے عوامل پیدائش کا نفع میں کوئی حق نہیں اس لیے جو شخص مزدور کو کل نفع منتقل نہیں کرتا وہ مزدور کا استحصال کرتا ہے تو کیا ایسا کہنے والے کو حق بجانب سمجھا جائے گا ؟ اور کیا استحصال کی یہ تعریف انصاف کے اصولوں پر پوری اتر سکے گی ؟ ظاہر ہے کہ یہ انصاف نہیں سراسر ظلم ہو گا۔ مگر ناواقفین کو شاید یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ اس دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جو اسی ظلم کو انصاف قرار دیتا ہے اور پیداوار کے منافع میں سے تمام عوامل پیدائش کو محروم کر کے تمام منافع کا حقدار مزدور کو ٹھہراتا ہے۔ یہ گروہ سوشلسٹوں کا گروہ ہے۔ سوشلزم کی نظر میں ہر وہ عمل جو پیداوار کا کل نفع مزدوروں کی طرف منتقل کرنے میں رکاوٹ بنے مزدور کے استحصال کے مترادف ہے۔ استحصال کی نوعیت کے اسی غلط تعین کا نتیجہ تھا کہ سوشلزم نے اس بیماری کا جو علاج تجویز کیا وہ نہ صرف یہ کہ مفید ثابت نہ ہوا بلکہ مضر نکلا۔

مارکس کا نظریۂ محنت

سوشلزم کے اس دعوٰی کی بنیاد کہ پیداوار کے کل منافع کا حقدار صرف مزدور ہے مارکس کے نظریۂ محنت پر ہے۔ اسی نظریۂ محنت سے مارکس نے قدر زائد کا نظریہ اخذ کیا ہے۔ قدر زائد کی اصطلاح کو تمام اذہان کے فہم سے

قریب تر لانے کے لیے پیداوار کا منافع کہہ لیجئے نظریۂ محنت کی رو سے کسی پیداوار کے منافع کا تعین مزدور کی محنت کی اس مقدار سے ہوتا ہے جو اس پیداوار کی تیاری کے لیے سماجی طور پر ضروری ہو۔ گویا صرف محنت ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود اپنی قدر سے زیادہ قدر پیدا کر سکے۔ محنت کے علاوہ دوسرے عوامل پیدائش اس صلاحیت ہی سے محروم ہیں۔ وہ صرف اپنی قدر کو کسی دوسری شے میں منتقل کر دینے تک محدود رہتے ہیں۔ اس نظریہ کی مزید وضاحت کے لیے یوں سمجھئے کہ عوامل پیدائش جب کسی پیداواری عمل میں حصہ لیتے ہیں اور پیداوار میں اپنی قدر منتقل کرتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کا حق بس اتنا ہی ہے کہ جتنی قدر پیداواری عمل میں کم ہوتی ہے۔ وہ انہیں واپس مل جائے اور وہ برقرار رہیں۔ اب محنت کے علاوہ دیگر عوامل پیدائش یعنی زمین، سرمایہ اور کاروباری جدوجہد چونکہ قدر زائد پیدا کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہیں اس لیے پیداوار میں صرف اتنی ہی قدر منتقل کرتے ہیں جتنی ان میں موجود ہوتی ہے۔ بخلاف محنت کے کہ وہ قدر زائد پیدا کرنے کی صلاحیت سے مزین ہے۔ اس لیے پیداوار میں وہ اپنی اصل قدر سے زیادہ قدر منتقل کرتی ہے۔ یہی قدر زائد پیداوار کی لاگت پر اضافہ کا باعث ہوتی ہے اور منافع کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ پیداوار کا کل منافع مزدور کی فاضل محنت کا حاصل ہے اور اسی لیے اس سارے منافع کا اصل مستحق اور جائز مالک مزدور ہے۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنے والا مزدور پانچ گھنٹے روزانہ کام کر کے جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ اس کی ان ضروریات

زندگی کے لیے کافی ہوتا ہے جن کے سہارے وہ زندہ رہ سکے اور اس میں محنت مزدوری کرتے رہنے کی صلاحیت برقرار رہے لہٰذا ان ہی پانچ گھنٹوں کی محنت سے پیدا کردہ قدر مزدور کی محنت کی اصل قدر ہے۔ مگر چونکہ مزدور ان پانچ گھنٹوں سے زیادہ بھی کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لیے اس سے مزید تین گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ ان تین گھنٹوں سے جو قدر پیدا ہوتی ہے وہی قدر زائد ہے۔ مزدور کو اُجرت میں پانچ گھنٹوں کی محنت سے پیدا شدہ قدر واپس ملتی ہے۔ بقیہ تین گھنٹوں کی محنت سے پیدا شدہ قدر بھی اسے ہی ملنی چاہیئے تھی مگر وہ اُسے نہیں ملتی۔ سرمایہ دار اس کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ سرمایہ دار مزدور کی قدرِ زائد پیدا کرنے کی صلاحیت سے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے اسی کا نام استحصال ہے۔

استحصال کی اسی غلط تعبیر نے سوشلسٹ قائدین کو غلط راہ پر لگا دیا۔ حالانکہ عقل و خرد اس بات کو کسی طرح تسلیم نہیں کرتی کہ کسی سامان کی تیاری میں حصہ تو چار عوامل لیں اور اس کا کل نفع کسی ایک عامل کے حصہ میں آئے۔ اس نظریۂ محنت کے استدلال کا سارا زور ہی اس بات پر ہے کہ کسی سامان کی لاگت اور حاصل کے درمیانی فرق کی پیدائش میں محنت کے علاوہ دوسرے عوامل پیدائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مارکس نے اس نظریہ کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کی اپنی ضخیم تصنیف "سرمایہ" میں لے دے کر جو ایک دلیل مارکس نے پیش کی تھی معاشیات کی جدید تحقیقات نے اُسے بھی غلط ثابت کر دکھایا۔ جدید نظریۂ قدر کی روشنی میں برابر داموں پر بکنے والی دو مختلف چیزوں میں مشترک چیز محنت نہیں بلکہ وہ تشفی (Satisfaction) ہے جو اشیاء صارفین کو

عطا کرتی ہیں۔ در اصل مارکس کا یہ نظریۂ محنت محض الفاظ کا الٹ پھیر ہے ورنہ کسی سامان کی تیاری میں دیگر عوامل کے حصّہ کا انکار ممکن نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ، زمین، سرمایہ اور کاروباری جد و جہد میں سے کسی ایک کے بغیر پیداواری عمل انجام پذیر ہو جائے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ عوامل پیدائش میں سے کسی ایک عامل کے بھی مطلوبہ تناسب میں حاصل نہ ہو سکنے سے پیداوار پر برا اثر پڑتا ہے اور اسی طرح ایک عامل کی مناسب مقدار میں موجودگی دوسرے عوامل کی کارکردگی پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اس امر میں شک کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ پیداوار کے حصول میں ہر عامل اپنا اپنا حصّہ ادا کرتا ہے اور اس لیے قدر زائد کی پیدائش بھی صرف محنت کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتی بلکہ چاروں عوامل اس کی پیدائش میں بھی اپنے اپنے طور پر حصّہ لیتے ہیں۔

استحصال کی غلط تعبیر کے نتائج

اگر استحصال کا یہی مفہوم ہے جو متذکرہ بالا نظریۂ محنت کی رو سے سمجھ میں آتا ہے تو یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قدر زائد یا دوسرے لفظوں میں پیداوار کے منافع کی پوری مقدار کبھی بھی اور کسی حالت میں بھی مزدور کے حوالے نہیں جا سکے گی۔ معاشی نظام کی کوئی بھی شکل متعین کی جائے مزدور کو قدر زائد (Surplus Value) کا ایک مناسب حصّہ ہی مل سکے گا پوری قدر زائد کسی صورت میں بھی اس کو نہ دی جا سکے گی۔ اگر مزدور کو پوری قدر زائد نہ ملنے کا نام استحصال ہے تو سوشلزم بھی اس استحصال کو باقی رکھنے پر مجبور ہے۔ ذرا اشتراکی قائدین بتائیں گے کہ کاروبار کو چلانے والے

منتظمین کی تنخواہیں کہاں سے ادا ہوں گی، غیر پیدا آور خدمات بجالانے والے
کارکنوں کی اُجرتوں کی ادائیگی کس مد سے ہو گی، زمین اور سرمایہ کے مالکوں
کے معاوضوں کی صورت کیا ہو گی، ریاست کے ملازمین اور کارکنوں کی تنخواہیں
یہ اشتراکی حضرات کہاں سے ادا کریں گے۔ کیا یہ سب کچھ اسی قدر زائد ہی میں
سے نکال کر نہ دیا جائے گا؟ پھر ان سب سے بڑھ کر معاشی ترقی اور توسیع
کے لیے مزید سرمایہ کی جو ضرورت ہو گی وہ اشتراکی قائدین کہاں سے مہیا کریں گے؟
کیا اس مزید سرمایہ کے بہم پہنچانے کی اس کے علاوہ بھی کوئی اور صورت ہے کہ
پہلے کی پیدا کی ہوئی قدر میں سے کچھ بچا کر رکھ لیا جائے۔ اگر ساری قدر زائد مزدور
کا حق ہے تو آئندہ عمل پیدائش جاری رکھنے کے لیے کچھ سرمایہ بچا کر رکھ لینا مزدور
کا حق مار دینے کے مترادف نہ ہو گا؟ اور اشتراکی نظریہ کے مطابق کیا اسی
کا نام مزدور کا استحصال نہیں؟ کیا کوئی ایسی صورت ممکن ہے کہ اس معنی میں
مزدور کا استحصال کیے بغیر آپ آئندہ عمل پیدائش کو جاری رکھ سکیں اور کیا
آپ کو اس حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت ہے کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی
آبادی اور معیار زندگی کو بلند تر کرنے کی خواہش کے پیش نظر وسیع بنیادوں
پر سرمایہ کاری کی ضرورت روز بروز زائد سے زائد تر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر
ساری قدر مزدور کی محنت کی پیدا کردہ ہے تو اس سرمایہ کاری جیسے اہم مقصد
کی خاطر مزدور کو بہر حال اپنی پیدا کی ہوئی قدر کے ایک حصہ سے محروم ہونا
ہی پڑے گا۔

غرض ہر صورت میں مزدور کو قدر زائد کا ایک حصہ ہی مل سکتا ہے پوری

قدر زائد کسی صورت نہیں مل سکتی۔ اگر اسی کا نام استحصال ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ انسانی زندگی کو اس طرح کے استحصال سے پاک کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ دراصل اشتراکیت اپنے دوسرے نظریات کی طرح اس نظریۂ محنت اور قدر زائد کے تصور میں بھی انتہائی مبالغہ کی شکار ہے۔ مزدور کے استحصال کی صحیح شکل وہی ہے جو ابتدا میں بیان ہوئی کہ قدر زائد میں سے تمام عوامل پیدائش کی حصہ رسدی کے اصول سے جتنے حصہ پر مزدور کا حق بنتا ہے اس سے یا اس کے کسی جزو سے مزدور کو محروم کر دیا جائے۔ اور یہی وہ استحصال ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔

نظام سرمایہ داری میں استحصالِ مزدور کے اسباب

مزدور کے استحصال کی صحیح نوعیت متعین کر لینے کے بعد اب اس کے علاج کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ذرا ایک نظر ان اسباب پر بھی ڈالتے چلیں جو سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار کو اس استحصال کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ دراصل اس سلسلہ میں اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں ہی غلط روی کا شکار ہیں۔ اشتراکیت اگر افراط کی طرف مائل ہے تو سرمایہ داری تفریط کی جانب راغب ہے۔ سرمایہ دار مزدور کو صرف اس کی مقررہ اُجرت کا حقدار ٹھہراتا ہے اور قدر زائد میں سے جتنا مناسب حصہ مزدور کا بنتا ہے اتنا پورا کا پورا مزدور کی طرف منتقل نہیں ہونے دیتا۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ مزدور کی اس اُجرت میں سے بھی مختلف حیلوں، بہانوں سے کچھ نہ کچھ ہتیا کر اپنا نفع بڑھانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ مارکیٹ کی مسابقت

(Competition) کی بنا پر جب اشیاء کی قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو لامحالہ ان قیمتوں کی کمی کا اثر ان اشیاء کی لاگت اور حاصل کے درمیانی فرق یعنی سرمایہ دار کے منافع پر پڑتا ہے۔ اس وقت سرمایہ دار بجائے اس کے کہ کم منافع پر قناعت کرے اپنی لاگت میں کمی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور لاگت کم کرنے کے لیے بھی اسے سب سے آسان طریقہ یہ نظر آتا ہے کہ مزدور کی اُجرت گھٹا دے یا اس کے اوقات کار میں اضافہ کر دے، بلکہ اکثر حالات میں تو سرمایہ دار مزدور کی اُجرت گھٹانے کے ساتھ ساتھ اس کے اوقاتِ کار میں بھی اضافہ کر دیتا ہے اور اس طرح دونوں طریقے استعمال کر کے اپنے منافع کی ساری کمی مزدور کا پیٹ کاٹ کر پوری کرتا ہے۔ حالانکہ انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ لاگت کی کمی کا اثر چاروں عوامل پیدائش پر بقدر حصہ رسدی پڑے، محض مزدور ہی قربانی کا بکرا نہ بنے۔ مزدور بے چارہ اپنی بنیادی ضروریات کی تشفی کے لیے کم سے کم اجرت اور زیادہ سے زیادہ اوقات کار کی شرط پر بھی کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ از خود مشین لگا کر آزادانہ پیدائش دولت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے۔ لاگت میں کمی کرنے کے لیے سرمایہ دار اس بات کی بھی کوشش کرتا ہے کہ انسانی محنت کا کام گھٹا کر مشینوں کا استعمال بڑھائے۔ اس کے نتیجہ میں بے روزگاری جنم لیتی ہے اور یہ بے روزگاری مزدور کی مجبوری میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ اور اس طرح مزدور دن بدن بے روزگاری اور افلاس کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔

اشتراکیت کے ہاتھوں مزدور کا استحصال

دراصل مزدور بے چارے کو تو کہیں بھی امان نہیں۔ سرمایہ دار ہی اس کا استحصال نہیں کرتا۔ اس سے زیادہ استحصال کی چکی میں تو وہ بے چارہ اپنے ان سوشلسٹ کرم فرماؤں کے ہاتھوں پستا ہے جو اس کی خیر خواہی کی بنیاد پر اپنے نظریات کی پوری عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ کہنے کو تو ساری قدر زائد کا مالک وہ مزدور کو ٹھہراتے ہیں مگر عملاً قدر زائد کا اتنا حصّہ بھی اس کے قبضہ میں نہیں رہنے دیتے جتنا وہ اجرت کی صورت میں سرمایہ دار سے حاصل کر لیتا تھا۔ اشتراکیت اجتماعی مصالح کے نام پر مزدور سے سب کچھ چھین لیتی ہے اور روٹی کپڑا اور مکان سے زیادہ کسی چیز پر اس کا قبضہ برقرار نہیں رہنے دیتی اور اور ان تینوں بنیادی ضرورتوں کی فراہمی بھی اس انداز سے، کہ روٹی لنگر خانوں سے لگی بندھی، کپڑا محض تن ڈھانپنے کی حد تک اور سر چھپانے کے لیے کیمپوں کی صورت میں مکان۔ غرض مزدور نہ ہوا، تھان سے بندھا ہوا جانور ہوا۔ اشتراکیت جس پیمانہ پر مزدوروں کا استحصال کرتی ہے اس کے مقابلہ میں سرمایہ دارانہ استحصال، ہیچ نظر آتا ہے۔ دعویٰ تھا مزدور کے استحصال کے علاج کا اور عملی طور پر ہوا یہ کہ استحصالِ زر نے استحصالِ جان کی سی شکل اختیار کر لی۔ سبب اس کا وہی تھا کہ استحصال کی نوعیت کے تعین میں مبالغہ سے کام لیا گیا۔

استحصال کی غلط تعبیر کے نتیجے میں غلط علاج

بہر حال استحصال مزدور کی نوعیت کے غلط تعین نے اشتراکیت کو غلط علاج کی راہوں پر ڈال دیا۔ چونکہ اشتراکی مفکرین نے پہلے ہی مرحلہ پر ساری

قدرِ زائد کا حقدار مزدور کو مان لیا تھا اس لیے منطقی نتیجہ کے طور پر ان کی فکر بالآخر اسی مرحلہ پر پہنچ کر رکی کہ مزدور کا یہ استحصال اس نظام پیدائش کے لازمی نتائج کے طور پر وجود میں آتا ہے جس کی بنیاد ذرائع پیدائش کی انفرادی ملکیت پر ہے۔ سرمایہ دار کی نیت یا اس کے کردار کو اس استحصال میں کوئی دخل نہیں بلکہ ہر سرمایہ دار اس پر مجبور ہے۔ جو سرمایہ دار بھی اپنے اس طرزِ عمل سے گریز کرے گا حالات کا دباؤ اسے پھر پہلی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے گا۔ اگر سرمایہ دار ساری قدرِ زائد مزدور کے حوالے کر دے تو اُسے خود کوئی آمدنی نہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں سرمایہ دار کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی لہٰذا وہ ساری قدرِ زائد کسی حالت میں بھی مزدور کے حوالے کرنے پر راضی نہ ہوگا۔ اس مرحلہ تک پہنچ کر اشتراکی مفکرین کو اس کے سوا اور کوئی راہ نظر نہ آئی کہ ذرائع پیدائش پر انفرادی ملکیت ہی کو باطل قرار دے دیا جائے اور تمام پیدا آور قوتیں اجتماع کے قبضہ و اختیار میں دے دی جائیں۔ ان کی نظر میں ذرائع پیداوار کی ملکیت افراد کے بجائے ریاست کی طرف منتقل کر دینے سے مزدور کے استحصال کے امکانات ختم ہو جاتے تھے مگر تجربہ نے بتا دیا کہ یہ ان کا محض خیالِ خام تھا۔ کیونکہ پیداواری رشتے (Relations of Production) خواہ کچھ بھی ہوں، خواہ ساری قدرِ زائد محنت کے ثمرہ کے طور پر وجود میں آئی ہو۔ خواہ چاروں عوامل اس کی پیدائش میں حصہ لیتے ہوں۔ استحصال کا امکان بہرصورت موجود رہتا ہے۔ سماج کے چند افراد ہی ہوتے ہیں جو اہم پیداواری فیصلے کرتے ہیں جن کے ذریعہ دولت

پیدا کرتے اور تقسیم کرنے کا عمل انجام پاتا ہے۔ استحصال کا انحصار انہی افراد کی نیت پر ہے۔ یہ افراد اگر پیداواری عمل میں شریک ہونے والے دوسرے گروہوں کا استحصال کرنا چاہیں تو چونکہ عام افراد کی بہ نسبت ان کے ہاتھوں میں معاشی طاقت زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہ بآسانی استحصال کر سکتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری میں یہ طاقت زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اشتراکی نظام میں اس طاقت کے مالک حکمران جماعت کے سربرآوردہ عمّال حکومت ہوتے ہیں بلکہ معاشی طاقت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھوں میں تو غیر معمولی سیاسی طاقت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ گروہ جب مزدور کے استحصال پر اتر آتا ہے تو سرمایہ دارانہ استحصال کی اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رہ جاتی۔

حقیقت یہی ہے کہ اشتراکیت کے نظریۂ استحصال سے اگر مبالغہ دور کر دیا جائے تو بات صرف اتنی ہی رہ جاتی ہے کہ سرمایہ دارانہ استحصال کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ پیداوار کی قدر زائد میں سے مزدور کو اس کے مناسب حصہ سے محروم کر دیا جائے اور نیز یہ کہ سرمایہ دارانہ استحصال محض ایک امکان ہے جسے واقعہ کا جامہ پہنانے کے لیے سرمایہ دار کا اپنا ارادہ ضروری ہے۔ چنانچہ اس استحصال کا اگر علاج درکار ہے تو وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایسے انتظامات کیے جائیں کہ پیداوار کی قدر زائد میں سے جتنے حصہ پر مزدور کا حق بنتا ہے اس کے حصول میں اسے کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے اور معاشرہ ایسی بنیادوں پر تعمیر کیا جائے کہ استحصال مزدور کا امکان عملاً کم

نہ پہن سکے۔ لوگ استحصال کے مواقع ہوتے ہوئے بھی استحصال سے باز رہیں۔ یہی راستہ اعتدال کا راستہ ہے اور اسی راستے پر چل کر مزدور کے استحصال کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے۔

استحصال کے سدِ باب کے لیے اسلام کا طریقۂ کار

اسلام کے نقطۂ نظر سے جب ہم اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اشتراکیت و سرمایہ داری کے افراط و تفریط سے ہٹ کر ٹھیک یہی وہ اعتدال کا راستہ ہے جو اسلام اس باب میں اختیار کرتا ہے۔ اسلام نہ سرمایہ دار کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ مزدور کا استحصال کرے اور نہ مزدور کو یہ آزادی بخشتا ہے کہ وہ اپنے جائز حق سے بڑھ کر سرمایہ دار کے حصہ پر دست درازی کرے۔ اسلام سرمایہ دار اور مزدور دونوں کے حقوق و فرائض متعین کرتا ہے اور پھر اس بات کا پورا پورا انتظام کرتا ہے کہ دونوں فریق میں سے کوئی ایک بھی کسی دوسرے پر ظلم و تعدی نہ کر سکے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے تو وہ دونوں فریق کی اخلاقی اصلاح اس انداز میں کرتا ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی جگہ پر حق رسی سے دو قدم آگے بڑھ کر ایثار و قربانی پر آمادہ نظر آنے لگتا ہے۔ پھر اس اخلاقی اصلاح کے ساتھ اس مقصد کے حصول کی خاطر اگر قانونی ذرائع کا استعمال کرنا پڑے تو اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اسلام کے عدل اجتماعی کی رو سے جو جو تدابیر اس سلسلہ میں عمل میں لائی جا سکتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) کارکنوں کے مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری حکومت اپنے سر لے اور اس مقصد کی خاطر مزدوروں کی کم سے کم تنخواہ اور زیادہ سے زیادہ

اوقاتِ کار کی حد قانونی طور پر مقرر کر دی جائے۔ بونس اور پنشن وغیرہ کے حقوق بھی متعین کر دیئے جائیں۔ رہائشی کوارٹرز کی فراہمی اور علاج معالجہ کے انتظامات بھی یا حکومت خود کرے یا کارخانہ داروں اور صنعت کاروں کے ذریعہ کرائے۔

(۲) مزدور اور صنعت کار کے باہمی حقوق و فرائض کے بنیادی اصول حکومت کی طرف سے متعین کر کے ان کی تفصیلات کا تعین دونوں فریق کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے مگر حکومت اس بات کا خاص خیال رکھے کہ ایسے حالات کسی صورت پیدا نہ ہونے دیئے جائیں کہ جس سے کوئی ایک فریق دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھا سکے۔

(۳) حکومت ایسی کمیٹیاں اور عدالتیں قائم کرے جو مزدور اور صنعت کار کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ قلیل سے قلیل مدّت میں کرنے کی ذمہ دار ہوں تاکہ ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کی نوبت ہی نہ آئے۔ ان عدالتوں کو عدالتی فیس وغیرہ سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے اور طریقۂ حصول انصاف بھی آسان سے آسان تر بنا دیا جائے تاکہ ہر معمولی سے معمولی مزدور کو ان عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

(۴) مزدوروں کو انجمن سازی کی پوری اجازت ہو تاکہ وہ منظم طریقہ سے اپنے حقوق کی خود بھی حفاظت کرنے کے اہل ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مزدور کو ایک کارخانہ چھوڑ کر دوسرے کارخانہ میں کام کر لینے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ ہو۔

(۵) کسی صنعت و حرفت میں انسانوں کی جگہ مشینوں سے کام لینے کی اس وقت تک اجازت نہ دی جائے۔ جب تک اس بات کا پورا جائزہ نہ لیا جائے کہ اس طرح بے کار ہونے والے مزدوروں کی روزی کا کیا بندوبست ہو گا۔

یہ متذکرہ بالا عملی تدابیر تو وہ ہیں جو مزدور کے استحصال کا سدِ باب کرنے کے لیے فوری طور پر عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ ان انتظامات کے ساتھ ہی ایک مستقل تدبیر کے طور پر اس بات کا بھی جائزہ لیا جائے کہ کیا کوئی ایسا طریقہ ممکن ہے۔ جس کے ذریعہ یہ معلوم ہو سکے کہ قدر زائد کی پیداوار میں کس عامل کا کتنا حصہ ہے۔ اگر ماہرین معاشیات اس طریقہ کے معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو سارا جھگڑا ہی مٹ جاتا ہے۔ جس عامل کا جتنا حصہ قدر زائد کی پیدائش میں ہو اتنا ہی حصہ منافع میں سے اس کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ گو ایسا معلوم کرنے کا ابھی تک کوئی یقینی ذریعہ دریافت نہیں ہو سکا ایک واحد طریقہ مارجنل پیداآوری (Marginal Value Productivity) کے نظریہ کی بنیادوں پر موجود ضرور ہے مگر وہ بہت ہی محدود اور مخصوص حالات ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس قدر کے تعین میں بازار کے بدلتے ہوئے حالات کو اتنا دخل ہے کہ مارجنل پیداآوری کے ذریعہ بھی قدر زائد کی پیدائش میں ہر عامل کا واقعی حصہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ بہرحال یہ بات ماہرین معاشیات کی تحقیق کی محتاج ہے اگر یہ لوگ اس طرف توجہ کریں اور انکی کوشش بارآور ہو جائیں تو مزدور کے استحصال کا جھگڑا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے

***

مزدور اسلامی معاشرہ میں

اس حقیقت سے کس کو مجال انکار ہے کہ نظام سرمایہ داری کے نتیجے میں مزدور ظلم و استبداد کی چکی میں اس طرح پس کر رہ جاتا ہے کہ مشین کے پرزوں سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ اکثر حالات میں تو بے رحم سرمایہ دار بے جان مشینوں کو جاندار انسانوں پر ترجیح دے کر مزدور کو بے روزگاری کے ہاتھوں جیتے جی موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ قلیل تنخواہیں، اوقاتِ کار کی زیادتی، ضروریات زندگی سے مزدور کی محرومی اور مزدور کے علاج معالجہ و رہائش کے ضروری انتظامات سے سرمایہ دار کی لاپرواہی، یہ وہ حقائق ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی بے قید معیشت کا لازمی نتیجہ ہیں اور جن کی بنا پر مزدور کی زندگی جہنم کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان سب پر مزید یہ کہ سود اور سٹہ کے کاروبار اور احتکار و اکتناز کی کھلی آزادی نے سرمایہ داروں کو اپنی اجارہ داریاں قائم کرنے کے ایسے مواقع فراہم کر دیئے ہیں کہ وہ ان کے بل بوتے پر مزدور کو اس حد تک بے دست و پا اور اپنا دست نگر بنا لیتے ہیں کہ ان کی حیثیت سرمایہ داروں کے ہاتھ میں زر خرید غلاموں سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔

مزدور کی زبوں حالی

مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ مزدور کو اس کی اس زبوں حالی سے نجات دلانے کا دعویٰ لے کر جو نظامِ میدان میں آیا اس نے بیمار مزدور کا علاج کرنے کے بجائے اپنی بے تدبیری کی بنا پر یا اپنی مخصوص پوشیدہ اغراض کی انجام برآری کی خاطر اسے بسترِ مرگ سے لگا دیا۔ پُرانے سرمایہ دار کے ہاتھوں اس کی حالت اگر زر خرید غلاموں کی سی تھی تو اس نئے سرمایہ دار کی بدولت وہ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ نیا سرمایہ دار اشتراکی نظام کا علمبردار تھا۔ اشتراکی نظام میں مزدور کے سر پر وہ بھتیں تو بدستور مسلط رہیں جو سرمایہ داری نے ان کا مقدر بنادی تھیں ان میں کمی تو کیا ہوتی اضافہ ہی ہوا۔ اس پر مزید ہوا یہ کہ اشتراکیت نے اجتماعی مصالح کے نام پر مزدور پر ایسی ایسی حدود و قیود عائد کیں اور ایسی سختیاں روا رکھیں کہ مزدور آدمی نہ رہا کولہو کا بیل بن کر رہ گیا۔ مزدور کی قوت سے کہیں زیادہ اس سے کام لینا، ہڑتال کے حق سے اس کی محرومی، معمولی باتوں پر شدید سزائیں، اس کی عورتوں اور بچوں کو بھی محنت مشقت پر مجبور کرنا اور ان سب کے بدلہ میں چند روٹی کے ٹکڑے موٹا جھوٹا کپڑا اور رہائشی کیمپ کا میسر آجانا، یہ سب وہ عنایتیں تھیں جو اشتراکیت کی بدولت مزدور کے حصہ میں آئیں۔

مزدور کے دُکھ کا علاج صرف اِسلام کے پاس ہے

غرض سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت مزدور کے دُکھ کا علاج ان دونوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ اس کے دُکھ کا علاج اگر کسی کے پاس ہے تو وہ اسلام

ہے مگر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ خود اسلام کے نام لیوا اسلام کے بجائے اشتراکیت کو مزدور کا نجات دہندہ خیال کرتے ہیں۔ وہ اشتراکیت جو اپنی پچھلی پچاس پچپن سالہ تاریخ میں مزدور کو محرومی اور محض محرومی کے سوا اور کچھ نہ دے سکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر اسلام کو اس لحاظ سے تہی دامن سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے معاشرہ میں مزدور کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے صرف چند سرسری ہدایات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں ایک ٹھوس عملی نظام تجویز کیا ہے۔ زیر نظر تحریر میں تفصیلی بحث کی تو کوئی گنجائش نہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف دو ارشادات پیش کرتا ہوں جن میں آپ نے انتہائی معجزانہ انداز میں تمام وہ بنیادی اصول سمو دیئے ہیں جو اسلامی معاشرے میں مزدور کا صحیح صحیح مقام متعین کرنے میں رہنمائی کا کام دیتے ہیں اور جن کے ذریعہ مزدور کی موجودہ تمام بیماریوں کا علاج بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاكُلُ، وَ لِيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مِمَّا يَغْلِبُهُمْ فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ۔ (بخاری شریف)

"خَوَلُ (تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے) تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارا ماتحت بنا دیا ہے۔ پھر جس کا بھائی کسی کے ماتحت ہو تو چاہیئے کہ جو خود کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے

اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو انہیں مغلوب کر دے اور اگر ان پر بار ڈالو
تو ان کی اعانت کرو۔"

یہ حدیث مبارکہ معاشرہ میں مزدور کو ایک باوقار مقام عطا کرنے کے ساتھ
ساتھ تین ایسے رہنما اصول پیش کرتی ہے جن پر عمل کرنے سے ان تمام خرابیوں
کا سدِ باب ہو جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ استحصال کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں سب
سے پہلے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا ہی میں نہایت جامع انداز میں
یہ واضح فرما دیا کہ مزدور بھی معاشرہ میں سرمایہ دار ہی کی طرح برابر کے باعزّت
مقام کا حامل ہے اور ان دونوں کے درمیان اخوّت کا رشتہ پایا جاتا ہے اسلیئے
ان کے باہمی حقوق و فرائض کا تعین بھی بھائی چارے کی بنیاد پر ہونا چاہیئے۔ اس
کے بعد آپ نے مزدور اور سرمایہ دار کے باہمی تعلقات کی نوعیت واضح فرمانے
کے لیے تین رہنما اصول بیان فرمائے۔ اوّل یہ کہ ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی
کے لحاظ سے مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان کسی قسم کا تفاوت باقی نہیں
رہنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اوقاتِ کار کی حد اور کام کی نوعیت کا تعین وغیرہ
جیسے معاملات مزدور کی قوّتِ عمل اور جسمانی استطاعت کو مدِ نظر رکھ کر طے کیے
جانے چاہئیں اور تیسرا رہنما اصول آپؐ نے یہ بیان فرمایا کہ اگر پیداواری عمل میں
اضافہ درکار ہے تو اس کے لیے یہ صورت درست نہیں کہ ایک ہی مزدور پر کام
کے بوجھ میں اضافہ کر دیا جائے بلکہ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ مزید مزدوروں
کی خدمات حاصل کی جائیں۔ آیئے متذکرہ بالا حدیث مبارکہ کی روشنی میں ان چاروں
امور کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں۔

مزدور اور سرمایہ دار آپس میں بھائی بھائی ہیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ابتدائی الفاظ ہیں۔

اخوانکم خولکم جعل اللہ تحت ایدیکم۔

(تمہارے ماتحت تمہارے بھائی ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا ماتحت بنا دیا ہے)

یعنی ابتدائے آفرینش کے لحاظ سے تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ تو اس کارخانۂ کائنات کا نظام درست رکھنے کے لیے حکمت خداوندی اس کی مقتضی تھی کہ بعض کو بعض کے ماتحت رکھا گیا۔ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ورنہ وہ شخص جو کسی کا ماتحت ہے اسی طرح معاشرہ میں ایک باوقار مقام کا حامل ہے جس طرح وہ شخص جس کی ماتحتی میں اُسے دیا گیا ہے۔ کسی کا ماتحت اور کسی کا مافوق ہونا معاشرہ میں ان کے مقام میں کوئی کمی زیادتی نہیں کرتا۔ ماتحت اور مافوق دونوں بھائی چارے کے رشتے میں منسلک ہیں اس لیے دونوں برابر کے مقام کے حامل ہیں اور اسی لیے ان کے تمام باہمی تعلقات کی بنیاد، تمام باہمی حقوق و فرائض کا تعین اسی اخوت کے رشتہ کو مدِ نظر رکھ کر کرنا ہوگا۔

پیشہ ورانہ طبقات کی بیخ کنی

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مختصر مگر جامع جملہ جہاں مزدور اور نوکر کو معاشرہ میں ایک باعزت مقام عطا کرتا ہے وہاں ہر قسم کے پیشہ ورانہ طبقات کی بھی بیخ کنی کرتا ہے۔ کسی مخصوص پیشہ کی بنا پر کوئی شخص ذلیل اور کوئی شخص عزیز

نہیں بنتا۔ مزدور محنت مزدوری کا پیشہ اختیار کرنے سے کمتر نہیں ہو جاتا اور سرمایہ دار کاروباری جد وجہد کی ذمہ داری سنبھال لینے سے باعزت نہیں بن جاتا پیشے کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ اخوانکم خولکم کے الفاظ نے پیشہ ورانہ طبقات کی تمام درجہ بندیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اسلام کے نزدیک فضیلت کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ انسان کا ذاتی کردار ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔

(اللہ کے نزدیک سب سے افضل وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہو)

جو جتنا پرہیز گار ہوگا وہ خواہ مزدور ہو یا سرمایہ دار اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک زیادہ افضل قرار پائے گا اور ظاہر ہے جو اللہ کے نزدیک افضل ہے وہی اس کا مستحق ہے کہ اللہ کے بندوں کے نزدیک بھی افضل ٹھہرے۔ اور معاشرہ میں بلند مقام کا حامل ہو۔

ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی سطح برابر ہونی چاہیئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متذکرہ بالا حدیث کا دوسرا ٹکڑا ہے۔

فمن کان اخوہ تحت یدہٖ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس۔

"یعنی جس کا بھائی کسی کے ماتحت ہو تو اُسے چاہیئے کہ جو کچھ خود کھاتا ہو وہ اُسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اُسے پہنائے۔"

گویا کھانے پہننے اور رہنے سہنے اور دیگر ضروریات زندگی کی حد تک ماتحت اور مافوق دونوں کی معاشی سطح برابر ہونی چاہیئے۔ مزدور کو اتنی اجرت بہرحال ملنی چاہیئے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی بآسانی فراہم کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ ضروریات زندگی کے لحاظ سے وہ اپنے مالک کے برابر ہو سکے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں مزدور جس استحصال کی چکی میں لپتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد نے اس کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دی۔ اسلام اس کا ہرگز روادار نہیں، کہ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی سطح کے درمیان اس حد تک تفاوت پیدا ہو جائے کہ ایک آقا اور دوسرا غلام نظر آنے لگے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اسی ایک ارشاد پر اگر آج عمل کر لیا جائے تو موجودہ معاشی نظام کی خرابیوں کا سد باب ہو جائے۔ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی سطح میں زمین آسمان کا جو فرق سرمایہ دارانہ نظام میں ہے وہ تو ظاہر ہی ہے مگر اس امر واقع سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ اشتراکی نظام بھی جو مزدور کا بزعم خود نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔ مزدور اور سرمایہ دار کی معاشی سطح کے اس تفاوت کو آج تک دور نہیں کر سکا۔ اس فرق کو وہ دور تو کیا کرتا اشتراکی نظام کے نتیجے میں یہ تفاوت بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔ اشتراکی ممالک میں آج بھی مزدور اور کارخانہ کے ڈائریکٹروں اور مینیجروں کے درمیان تنخواہوں کا عام فرق ایک اور اکیس کا ہے۔ بعض حالات میں تو یہ فرق ایک اور سو کی حد تک پہنچ جاتا ہے، کیا اسی کا نام اشتراکی مساوات ہے۔ اشتراکیت کو مزدور کا نجات دہندہ سمجھنے والے ذرا غور کریں، مزدور جس مصیبت میں گرفتار تھا

کیا واقعی اشتراکیت نے اُسے اس مصیبت سے نجات دلادی اور اس کے مقابلہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے اس رہنما اصول پر نظر ڈالیں کہ فلیطعمہ مما یاکل و لیلبسہ مما یلبس۔ مزدور کی نجات کا راز کس میں مضمر ہے؟ سرمایہ داروں کی صرف ٹولی بدل دینے میں یا مزدور اور سرمایہ دار دونوں کو معاشی سطح کے لحاظ سے ایک مقام پر کھڑا کر دیتے ہیں؟ مزدور کا نجات دہندہ کون ہے؟ اشتراکیت یا اسلام؟

مزدور سے اس کی استطاعت سے زیادہ کام نہ لیا جائے

سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کے استحصال کی سب سے نمایاں شکل یہی ہے کہ مزدور سے اس کی استطاعت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اور اُجرت بہت قلیل دی جاتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ولا تکلفو ھم ما یغلبھم (اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو انہیں مغلوب کردے) اس باب میں اس قدر جامع ہے کہ مزدور کے اوقاتِ کار کی حد اور کام کی نوعیت کے تعین وغیرہ جیسے تمام معاملات اسی ایک جملہ کی روشنی میں بڑی خوش اسلوبی سے طے کیے جا سکتے ہیں۔ مزدور سے اس کی استطاعت سے زیادہ کام لینا اور اس کے اوقاتِ کار مناسب حد سے زیادہ رکھنا نظام سرمایہ داری کا ایک ایسا ظلم ہے کہ محض اسی ایک ظلم کی بنیاد پر کارل مارکس نے پورا ایک نظریۂ محنت (Labour Theory of Value) گھڑ کر رکھ دیا اور اس میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ مزدور کی محنت کے مقابلہ میں دیگر

عوامل پیدائش کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ چھوڑی اور اس طرح وہ ظلم جو سرمایہ داری نظام میں مزدور کے حق میں تھا۔ اشتراکیت میں ختم ہونے کے بجائے مزدور سے ہٹ کر دیگر عوامل پیدائش کے حق میں ظلم بن گیا۔ گویہ سب کچھ محض نظریہ (Theory) کے طور پر ہوا، عملی طور پر تو مظلوم اشتراکیت میں بھی بے چارہ مزدور ہی رہا بلکہ اس کے ظلم میں کچھ اضافہ ہی ہوگیا۔ غرض مزدور پر اتنا کام لاد دینا کہ اس کے بوجھ سے مزدور پس کر رہ جائے ایسی لعنت ہے جو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں نظام ہائے معیشت میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہ دونوں نظام اس لعنت کو مٹانا تو درکنار اس کو باقی رکھنے پر مصر نظر آتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنی لاگت میں کمی کی غرض سے مزدور پر کام کا زیادہ سے زیادہ بوجھ لا دتا جاتا ہے تو اشتراکی قائدین بالکل یہی کام اجتماعی مفاد کے نام پر کرتے ہیں۔ مزدور بے چارے کی کسی کو فکر نہیں۔ مزدور بے چارہ مجبور ہے کہ اس کے آقا جن شرائط پر چاہیں اس سے کام لیں۔ اشتراکیت تو اسے اجازت ہی نہیں دیتی کہ وہ اُجرت پر کام کرلے کے بجائے آزادانہ طور پر اپنی معاش کا کوئی ذریعہ اختیار کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بھی جدید آلاتِ پیدائش اور بڑی بڑی قیمتی مشینیں وجود میں آجانے کی بنا پر مزدور میں اتنی استطاعت ہی نہیں کہ وہ ان مشینوں کو ذاتی طور پر حاصل کرکے آزاد پیدائش دولت کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے اور اس طرح اپنے آقاؤں کے ظلم سے نجات پائے۔ وہ مجبور ہے کہ زیادہ سے زیادہ اوقات کار کے باوجود اُجرت پر کام کرتا رہے تاکہ اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات تو کسی طور مہیا کرسکے، خواہ

وہ اس کام کے بوجھ تلے موت سے پہلے ہی کیوں نہ مر جائے۔ بہر حال سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت مزدور کے اس دکھ کا علاج کسی ایسے نظام میں تلاش کرنا جو محض مادہ پرستانہ بنیادوں پر قائم ہو محض ایک فعل عبث ہے۔ مادہ پرستی کی لغت میں انسانی ہمدردی نام کی تو کوئی شے موجود ہی نہیں۔ اس کی نظر میں انسان انسان نہیں مشینوں کے پرزے ہیں۔ مزدوروں کے اس دکھ کا علاج تو وہی نظام کر سکتا ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہو اور مزدور کو بھی انسان خیال کرتے ہوئے اس سے انسانوں جیسا سلوک کرتا ہو۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ولا تکلفوھم ما یغلبھم اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مزدور بھی انسان ہیں۔ اور اس لیے انسانی سلوک کے حقدار ہیں۔ انہیں بار بردار جانور یا بے جان مشین کے پرزے نہ خیال کرو۔ اپنے مفاد کی خاطر ان سے اتنا کام نہ لو جو انہیں مغلوب کر کے رکھ دے بلکہ اتنا ہی کام لو جتنا وہ آسانی سے کر سکیں۔

پیداوار میں اضافہ کی خاطر مزدور کے کام میں اضافہ کر دینا درست نہیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کا آخری ٹکڑا فان کلفتموھم فاعینوھم، (اور اگر ان پر کام کا بوجھ ڈالو تو ان کی اعانت کرو) اس بات کی مزید وضاحت کر رہا ہے کہ پیداوار میں اگر اضافہ درکار ہو تو یہ طریقہ قطعاً درست نہیں کہ مزدور پر کام کے بوجھ میں اضافہ کر دیا جائے بلکہ مناسب یہ ہے کہ مزدور کے کام میں اس کا ہاتھ بٹایا جائے، خواہ کام کرانے والا خود مزدور کے ساتھ مل کر اس کام کے انجام میں اس کی مدد

کرے خواہ مزید مزدور بھرتی کرکے اس کام کو تکمیل تک پہنچائے۔ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت مزدور کے ساتھ اس رعایت کا التزام دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کرتا۔ کہیں انفرادی منافع بے چارے مزدور کے اس حق کے آڑے آجاتے ہیں اور کہیں اجتماعی مصالح کے پھیر میں مزدور اس حق سے محروم رہ جاتا ہے لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متذکرہ بالا ارشاد مزدور کے اس حق کو خاص اہمیت دیتا ہے اور اس کے خلاف کرنے کو ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ اشتراکیت تو خیر مزدور کو بے جان مشینوں سے زیادہ کوئی حیثیت ہی نہیں دیتی۔ اس کی نظر میں مزدور پر کام کے بوجھ کی زیادتی کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔ اُسے تو ہر حال میں زیادہ سے زیادہ پیداوار کا حصول درکار ہے۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار میں اضافہ ہی صرف ایک مقصد نہیں ہے جس کی خاطر مزدور کو اس کی طاقت سے زیادہ کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے بلکہ اکثر حالات میں تو سرمایہ دار محض اپنی لاگت میں کمی کی خاطر مزدور پر کام کا بوجھ لادتا چلا جاتا ہے۔ سرمایہ داروں کے درمیان مسابقت (Competition) کے نتیجہ میں جب اشیاء کی قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو اس کا لازمی اثر سرمایہ دار کے منافع پر پڑتا ہے۔ اپنا نفع کم ہوتے دیکھ کر سرمایہ دار اپنی لاگت میں کمی کی فکر کرتا ہے۔ اور اس کا سب سے آسان طریقہ اُسے یہی نظر آتا ہے کہ مزدور کے اوقاتِ کار میں اضافہ کردے اور اس سے زیادہ سے زیادہ کام لے مزدور بیچارہ سب کچھ سہتا ہے اور اُف نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ صرف اسلئے کہ انسانی ہمدردی کا فقدان ہے۔ وہی انسانی ہمدردی جسکی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ دعوت دے رہے ہیں کہ فان کلفتموھم فاعینوھم

مزدوروں کے حقوق کی یہ رعایت متوقع بھی ایسی ہی ہستی سے ہو سکتی ہے جو تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آیا ہے اور جس کا لایا ہوا انظام حیات صرف مزدور ہی کی نہیں تمام طبقاتِ انسانی کی فلاح کا ضامن ہے۔

قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ معاشرہ میں مزدور کا صحیح صحیح مقام متعین کرنے کے سلسلے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ایک ہی ارشاد کس قدر جامع ہے۔ اگر آپ کے صرف اسی ایک ارشاد پر پوری طرح عمل کر لیا جائے تو مزدور کے استحصال کا سرے ہی سے خاتمہ ہو جائے اور جو برائیاں اس سلسلہ میں سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں ان سب کا مکمل علاج ہو جائے۔ مزدور کو اتنی اُجرت ملنے لگے جس سے وہ ضروریات زندگی کے لحاظ سے سرمایہ دار کے ہم پلہ ہو جائے۔ اس کے اوقاتِ کار صرف اس حد تک متعین ہوں جس حد تک وہ آسانی سے برداشت کر سکے، اس کی طاقت سے زیادہ اس سے کام نہ لیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ سرمایہ دار کا سلوک اس کے ساتھ بھائیوں جیسا ہو۔ اگر یہ سب سہولتیں مزدور کو میسر آجائیں تو پھر رہ کیا جاتا ہے جس کی حسرت مزدور کو باقی رہ جاتی ہو۔

مزدور کا منافع میں حصّہ

اشتراکی قائدین منافع میں مزدور کے حصّہ کا نعرہ بھی بڑے زور و شور سے بلند کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ پیداوار کے منافع میں مزدور کو حصّہ دار ٹھہرایا جائے۔ مگر ان کا یہ نعرہ محض نعرہ کی حد تک ہی ہوتا ہے جب عملی طور پر وہ خود معیشت کا انتظام سنبھالتے ہیں تو مزدور کا یہ حصّہ اشتراکی قائدین کی

تجوریوں ہی کی زینت بنتا نظر آتا ہے یا پھر اجتماعی مصالح کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، مزدور بے چارہ پھر خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ ہی رہ جاتا ہے۔ اسلام اس بارے میں بھی خاموش نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عطا و بخشش کے راستہ سے مزدور کو پیداوار کے منافع میں سے بھی کچھ نہ کچھ ملتے رہنا چاہیے۔ مسند احمد میں ایک روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

أَعْطُوا الْعَامِلَ مِنْ عَمَلِهٖ فَإِنَّ عَامِلَ اللّٰهِ لَا يُخَيَّبُ

"مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو کیونکہ اللہ کا مزدور نامراد نہیں کیا جاسکتا"

گو اس حدیث سے صراحتاً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اجرت کے علاوہ منافع میں سے بھی مزدور کا کچھ حصہ مقرر کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ فقہ کی کتابوں میں بھی اس کی کوئی تصریح نظر سے نہیں گذری مگر اس حدیث سے اتنا ضرور مترشح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیداوار کے منافع میں سے کچھ نہ کچھ عطا و بخشش کے طور پر مزدور کو دیتے رہنے کی ترغیب دلا رہے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد اس کی مزید تشریح کرتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے۔

إِذَا صَنَعَ لِأَحَدِكُمْ خَادِمُهٗ طَعَامًا ثُمَّ جَاءَ بِهٖ وَقَدْ وَلِيَ حَرَّهٗ وَدُخَانَهٗ فَلْيُقْعِدْهُ مَعَهٗ فَلْيَأْكُلْ فَإِنْ كَانَ الطَّعَامُ مَشْفُوهًا فَلْيَضَعْ مِنْهُ فِي يَدِهٖ أُكْلَةً أَوْ أُكْلَتَيْنِ :- (صحیح بخاری)

"تمہارا خادم جب تمہارا کھانا تیار کرے اور لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی دھوئیں کو اس نے برداشت کیا تھا تو چاہیئے کہ اپنے ساتھ اُس کو بٹھا لو اور کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر خادم کے ہاتھ میں کھانے سے کچھ چیز اٹھا کر رکھ دو، ایک لقمہ یا دو لقمے"

خادم یا مزدور کے ساتھ یہ سلوک صرف کھانے تک ہی محدود نہیں کھانے پر ہی دیگر تمام تیار شدہ اشیاء کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ غرض ان دونوں احادیث سے یہ بات وضاحت سے سمجھ میں آتی ہے کہ اس ارشاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہی ہے کہ مزدور کو اس کی مقررہ اُجرت کے علاوہ عطاء و بخشش کے طور پر بھی کچھ نہ کچھ وقتاً فوقتاً ملتے رہنا چاہیئے۔ چنانچہ اِن ارشاداتِ نبویؐ کی روشنی میں اگر پیداوار کے منافع میں سے بھی مزدور کو کچھ حصہ دیا جائے تو یہ بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کی تکمیل اور اسلامی نظامِ معیشت کی روح کے عین مطابق ہوگا۔ پیداوار کے منافع میں سے مزدور کو اس کے حصے کی ادائیگی کی صورتیں البتہ مختلف ہو سکتی ہیں۔ یہ حصہ ششماہی یا سالانہ بونس کی صورت میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ عمدہ کارکردگی پر انعام کی شکل میں بھی دیا جا سکتا ہے اور باہمی معاہدے کے نتیجے میں اس کی ایک مقررہ حد بھی طے کی جا سکتی ہے مگر اس قسم کے باہمی معاہدے سے متعلق ایک وضاحت ضروری ہے کہ بعض فقہا کے نزدیک جس کارخانے میں مزدور کام کر رہا ہو اس میں اگر اس کا حصہ مقرر کر دیا جائے تو پھر علیحدہ اجرت وصول کرنے میں قباحت ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ مزدوروں کو دوسرے کارخانوں کے حصص دے

دیئے جائیں۔

وہ حضرات جو مزدوروں کے بہی خواہی کے زبردست دعویدار ہیں، وہ اگر اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ذرا انصاف کی نظر سے غور کر کے بتائیں کہ معاشرہ میں مزدور کا وہ مقام جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متذکرہ بالا ارشادات کی روشنی میں متعین ہوتا ہے اس سے بہتر اس کے مثل ہی کسی دوسرے معاشی نظام میں متصور ہو سکتا ہے اور کیا یہی وہ مقام نہیں جو مزدور کی ان تمام مشکلات کا حل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں، اور جن کا علاج آج تک اشتراکی نظامِ معیشت سے بھی نہ ہو سکا۔

کسان، سوشلزم اور اسلام

دو متضاد وعدے

مزدور اور کسان اشتراکی تحریک کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یہی وہ دو طاقتیں ہیں جن کے سہارے انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے اور اشتراکی تحریک ان ہی دو طبقات کی حالت سدھارنے کا بڑی شد و مد سے دعویٰ کرتی ہے۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ جب اشتراکی قائدین مزدور اور کسانوں کی حالت سدھارنے کے سلسلے میں دو متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم وعدے کرتے ہیں۔ مزدوروں سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے مسائل کی اصل وجہ نجی ملکیت کا اصول ہے اس لیے اشتراکی حکومت تمام صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لے گی اور مزدوروں کی اُجرتیں بڑھانے کے ساتھ ان کے لیے تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کرے گی۔ اس کے برعکس کسانوں سے یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ اشتراکی حکومت تمام جاگیریں چھین کر تم لوگوں میں تقسیم کر کے تمہیں اپنی زیرِ کاشت زمینوں کے حقوقِ ملکیت عطا کرے گی اور اس طرح تم جاگیرداروں کے ماتحت کاشت کار بننے کی بجائے زمین کے مالک بن جاؤ گے۔ گویا وہی نجی ملکیت جو مزدوروں کے حق میں موجبِ زحمت تھی وہ کسان کے لیے موجبِ رحمت بن گئی۔ یوں

بھی یہ بات بڑی حیران کن ہے۔ نجی ملکیت کے ابطال کا اصول اشتراکیت کے جسم کے لیے روح کا حکم رکھتا ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کی بُنیاد پر اشتراکیت کی پُوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اشتراکیت سے اگر نجی ملکیت کے ابطال کا اصول نکال دیا جائے تو ایک مستقل نظریہ کی حیثیت سے اشتراکیت کی اصطلاح بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر کسانوں کے حق میں اشتراکی قائدین اپنے اسی بنیادی نظریے کو قربان کرتے نظر آتے ہیں۔ ظاہر نظر میں یہ بات یقیناً تعجب خیز ہے لیکن جو لوگ اشتراکی تحریک سے واقف ہیں ان کے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ دراصل اشتراکیت کی نظر میں تو زمینوں کے لیے بھی اجتماعی ملکیت اسی طرح ضروری ہے جس طرح صنعتوں کے لیے اور یہی مارکس کا بنیادی فلسفہ بھی تھا مگر اشتراکی قائدین کو چونکہ معلوم ہے کہ کسانوں کی ہمدردیاں اس وقت تک حاصل نہیں کی جاسکتیں جب تک انہیں زمینوں کا مالک بنانے کا لالچ نہ دیا جائے اس لیے صرف وعدے کی حد تک وہ نجی ملکیت کے ابطال کے اصول کو خیرباد کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے وعدہ کی ایفا کے وقت تو وہی کچھ کرنا ہے جو اشتراکی معاشی نظام کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

دراصل مزدور جن مشینوں پر کام کرتے ہیں ان مشینوں سے انہیں ذاتی طور پر کوئی لگاؤ یا نسبت نہیں ہوتی۔ انہیں اپنی بہتر اجرت اور کارکردگی کی آسانیوں سے غرض ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل کسان کو اپنی زیر کاشت زمین سے اپنی اولاد سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ اشتراکی قائدین مزدور اور کسان

کے فطری رجحانات سے بہرحال واقف تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مزدور کی طرف سے تو صنعتوں کو قومیانے پر کسی قسم کی مدافعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر زمینوں کو بھی قومی ملکیت میں لینے کا اعلان ابتدا ہی سے کر دیا گیا تو کسان کی ہمدردی ہرگز ہرگز اشتراکی تحریک سے نہیں ہو گی۔ چنانچہ انہوں نے مصلحت اسی میں جانی کہ کسان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اسے زمین کی ملکیت کا فریب دیا جائے تاکہ سرخ انقلاب برپا کرتے میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ بعد میں قوت و حکومت کے بل بوتے پر ان کسانوں کو بھی اجتماعی ملکیت کے فوائد سمجھائے جا سکیں گے اور زمینوں کو بھی صنعتوں کی طرح قومی ملکیت میں بآسانی لیا جا سکے گا۔ رہی وعدہ خلافی تو اشتراکی قائدین کی نظر میں ایسی وعدہ خلافی کوئی عیب نہیں جو اشتراکی معاشی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں ممد ثابت ہو۔ بقول لینن "ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے۔" (Lenins.
The collected Works.)

اشتراکی وعدے محض فریب ہیں

ہمارا یہ دعویٰ کہ کسانوں کو زمینوں پر نجی ملکیت کے حقوق دینے کے وعدے محض ایک فریب ہیں۔ کسی وہم و گمان پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہمارے اس دعویٰ کی گواہ اشتراکیت کی پوری تاریخ ہے۔ بالشویک تحریک کو آغاز ہی میں جو سب سے بڑی مشکل روس میں پیش آئی وہ یہی تھی کہ اگر مارکس کے فلسفہ کے مطابق قومی ملکیت کا اصول تمام زمینوں پر بھی نافذ کیا جائے تو اندیشہ

تھا کہ اس تحریک کی زبردست مخالفت ہو گی۔ چنانچہ زمین کے مسئلہ پر اشتراکی قائدین اور خود لینن نے ابتدا ہی سے متضاد بیانات دینے شروع کر دیئے۔ انہوں نے روسی کسانوں کو شروع میں اسی طرح، جس طرح آج پاکستانی اشتراکی یقین دلا رہے ہیں، یہ یقین دلایا کہ بالشویک تحریک کا مقصد بڑی بڑی جاگیروں پر قبضہ کر کے غریب کسانوں میں تقسیم کرنا ہے ۲۵ر فروری ۱۹۱۷ء کو پیٹرگراڈ کمیٹی نے جو پمفلٹ چھاپا اس میں اسی بات کا اعلان واضح الفاظ میں کیا گیا تھا (تاریخ انقلاب اکتوبر) لیکن اس کے دو مہینے یعنی اپریل ۱۹۱۷ء میں لینن نے تمام زمینوں کو قومیانے کا نعرہ بلند کر دیا (Ibid P. 46) مگر چونکہ وہ کسانوں کی ہمدردیاں بھی کسی قیمت پر ضائع کرنا نہ چاہتا تھا اس لیے گول مول انداز میں اس نے کسانوں سے وعدوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۲۲ر مئی ۱۹۱۷ء کو پیٹرگراڈ میں کسانوں کی نمائندہ سوویٹ روسی کانگریس کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بڑے پرجوش انداز میں لینن نے کہا:۔

"ہم چاہتے ہیں کہ کسان اب فوراً تمام بڑی بڑی جاگیروں پر قبضہ کر لیں اور اس کام میں اب ایک مہینہ کیا ایک ہفتہ بلکہ ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی جائے۔" ("The Collected Works". Vol. 24, P. 492.)

نتیجتاً روسی مؤرخوں کے قول کے مطابق کسانوں نے لینن کی اس خواہش کو اپنا خون دے کر پورا کیا: مارچ ۱۹۱۷ء اور جون ۱۹۱۷ء کے درمیانی عرصہ میں کسانوں کی سترہ تحریکوں کو کچلا گیا۔ اسی طرح ستمبر اور اکتوبر کے درمیان کسانوں کی پندرہ تحریکیں اٹھیں جنہیں اس وقت کی حکومت نے سختی سے دبانے میں ظلم و تشدد

کا کوئی طریقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے فوراً بعد اگلے روز ہی لینن نے زمین کی نجی ملکیت کی منسوخی کا تاریخی اعلان کر دیا۔ گو اس کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے بالشویک کارکنوں کو زبردست مخالفت اور جگہ جگہ کسانوں کی مسلح بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ کسانوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ آخر کس جرم کی پاداش میں وہ اپنی زمینوں سے دست بردار ہو جائیں۔ انقلاب کے پہلے مرحلہ میں لینن نے چھوٹے کسانوں کو بڑے بڑے جاگیر داروں کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے لیے ابھارا۔ کسان اپنے انجام سے بے خبر بڑے خوش تھے۔ انہوں نے بڑھ کر فوراً بڑی بڑی جاگیروں پر قبضہ کر لیا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ رفتہ رفتہ ان کا بھی نمبر آنے والا ہے۔ بڑے جاگیر داروں کا صفایا ہو جانے کے بعد روسی کسانوں کے تین قسم کے طبقے باقی رہ گئے۔ ایک وہ جو ذرا خوش حال تھے، دوسرے متوسط طبقہ سے متعلق رکھنے والے جو چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کے مالک تھے اور تیسرے وہ غریب کسان جو پہلی قسم کے خوشحال کسانوں کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ روسی اشتراکی قائدین ان تینوں طبقوں کو ختم کرنے کا پختہ عزم کر چکے تھے۔ مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ سب سے یکبارگی نمٹنے کی بجائے ایک ایک کا باری باری صفایا کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس تدریجی کارروائی کا آخری مرحلہ ۱۹۳۰ء میں طے ہوا۔

کسانوں کو زمین سے محروم کرنے کے لیے اشتراکیت کی مرحلہ وار یلغار

کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی تنظیمی کمیٹی نے ۲۷ جنوری ۱۹۱۸ء کو ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پہلے طبقہ سے تعلق رکھنے والے خوش حال کسانوں

کی تمام زمینیں سرکاری ملکیت میں لے لی جائیں۔ یہ لوگ روسی زراعت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنی زمینیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز تھیں۔ وہ اپنی زمینوں کو اشتراکی فلسفہ کی بھینٹ چڑھانے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے لیکن اشتراکی قائدین بھی اپنے فیصلہ پر عملدرآمد کا پورا تہیہ کر چکے تھے۔ شہروں سے مزدوروں کے غول ان کسانوں پر چڑھائی کر دینے کے لیے بھیج دیئے گئے۔ متوسط طبقہ کے کسانوں کو بھی ان کے خلاف بھڑکایا گیا۔ طبقاتی منافرت کے عفریت نے گاؤں گاؤں قریہ قریہ اپنے پنجے گاڑ دیئے۔ خوش حال کسانوں اور متوسط طبقہ کے کسانوں میں تمیز انتہائی مشکل تھی۔ پہلے طبقہ کے ساتھ ساتھ دوسرا طبقہ بھی پس گیا۔ چنانچہ اس کا اعتراف ایک موقعہ پر لینن نے خود بھی کیا ہے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں آٹھویں کانگریس پارٹی کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"کچھ مسئلہ کی پیچیدگی کی بناء پر اور کچھ ہمارے افسران کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس یلغار کی لپیٹ میں متوسط طبقہ کے کسان بھی بڑی تعداد میں آگئے ہیں جو صرف خوش حال کسانوں کے خلاف مخصوص تھی۔"

(Lenins The collected Works. Vol. 29. P. 159)

غرض اس اقدام کے خلاف کسانوں نے زبردست مداخلت کی۔ انہوں نے اپنی کھیتیاں اپنے ہاتھوں سے جلا دیں۔ شہروں کو غلہ کی رسد یکسر بند کر دی جس کے نتیجے میں شہری علاقوں میں قحط کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اینجلز کا دعویٰ تھا کہ امیر کسانوں سے زمینیں بڑی آسانی سے حاصل کی جا سکیں گی۔ زمین سے کسان

کی محبت سے وہ واقف نہ تھا۔ اب قدم قدم پر اینجلز کا یہ دعویٰ غلط ثابت
ہو رہا تھا۔ کسان کسی طرح بھی اپنی زمین سے دست بردار ہونے پر تیار نہ تھا۔
وہ پکار پکار کر اشتراکی قائدین کو ان کے وعدے یاد دلاتا اور زمین کی مساوی
تقسیم کا مطالبہ کرتا مگر اشتراکی قائدین ایفائے عہد سے پہلو بچا کر اشتراکی فلسفہ
بگھارنے میں معروف تھے اور اجتماعی ملکیت کے فوائد گنوا رہے تھے۔ کسان
بے چارہ مجبور تھا تنگ آمد بجنگ آمد کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا
مگر مسلح ظلم و تشدد کے سامنے اس کی کیا چل سکتی تھی۔ لاکھوں کسان اپنی جانوں پر
کھیل گئے۔ لیکن کسی نے جیتے جی اپنی زمینوں سے دست برداری گوارا نہ کی سوویٹ
مؤرخین اس بارے میں تو بالکل خاموش ہیں کہ اس تصادم میں کتنے کسان کام آئے
البتہ ان کی صحیح تعداد کا کچھ اندازہ ان اعداد و شمار سے ہو جاتا ہے جو وہ اپنے
ان روسی افسروں اور مزدوروں کے بارے میں دیتے ہیں جو ان کسانوں کی نام
نہاد بغاوت کو فرو کرنے کے دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ روسی
مؤرخین کے قول کے مطابق جولائی اور دسمبر ۱۹۱۸ء کے درمیانی عرصہ میں بائیس
ہزار روسی افسر مارے گئے اور تہتر ہزار کارکن کام آئے (Ibid.)
اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جب وہ لوگ جو حملہ آور تھے اور مسلح تھے اتنی
بڑی تعداد میں مارے گئے تو بے چارے نہتے کسانوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ ایک
فرانسیسی مصنف اپنی تصنیف " (The Rebel) " میں لکھتے ہیں
کہ اس تصادم میں پچاس لاکھ انسان کام آئے۔

غرض اسی طرح اشتراکی قائدین بڑے بڑے جاگیرداروں کے بعد پہلے اور

دوسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے کسانوں کا قبضہ بھی ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب صرف غریب کسان رہ گئے تھے اور وہ ابھی تک خوش تھے۔ کیونکہ بڑی بڑی جاگیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان غریبوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا مگر یہ صرف پہلا مرحلہ تھا۔ بڑے جاگیرداروں اور امیر کسانوں سے فراغت پاکر اشتراکی قائدین ان غریب کسانوں سے بھی تمام زمینیں چھین لینے کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ اس فیصلہ پر عملدرآمد کا آخری مرحلہ ۱۹۳۰ء کو انجام کو پہنچا۔ ہر قسم کی زمینیں سرکاری ملکیت قرار پائیں۔ کسان بے چارہ اشتراکی آمریت کے سامنے بے دست و پا تھا۔ سخت مایوسی کے عالم میں کسانوں نے اپنے جانوروں کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر ڈالا۔ کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیا مگر اب اِن باتوں سے کیا بنتا تھا، اشتراکیت کا جو منصوبہ تھا وہ بتدریج پورا ہوا۔ صنعتوں کیطرح زمینیں بھی بالآخر سرکاری ملکیت قرار پائیں اور وہ غریب کسان جو اشتراکی قائدین کے ہر اشارے پر صرف اس امید پر ناچتا رہا کہ ایک دن وہ بھی زمین کا مالک ہوگا اپنا پرانا مقام بھی گنوا بیٹھا۔ اب اس کا تعلق زمین اور اس کی پیداوار سے اتنا بھی نہ رہا جتنا ایک عام مزارع کا ہوتا ہے۔ اب اس کی حیثیت ایک عام مزدور سے زیادہ نہ رہی۔

اشتراکیت کی فریب کاری کی یہ داستان صرف روس تک ہی محدود نہیں جہاں جہاں بھی اشتراکیت نے اپنے قدم جمائے ہر جگہ کی تاریخ اسی قسم کی عبرت انگیزیوں سے بھری پڑی ہے۔ اب ذرا کسان کی حالت کا اندازہ لگایئے، اشتراکیت سے پہلے اور بعد کی دونوں حالتوں کا تقابل کر کے دیکھا جائے تو

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کسانوں کی حالت جاگیرداری کی تمام خرابیوں کے باوجود اس حالت سے بدرجہا بہتر تھی جو اشتراکی نظام قبول کرنے کے بعد اس کا مقدر بنی۔

اشتراکیت نے کسان کو کیا دیا

اشتراکیت کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کا مطمح نظر مزدور کی طرح کسان کی حالت کو سدھارنا ہے مگر اشتراکیت کے پوری طرح بروئے کار آنے کے بعد جو کچھ کسان کو ملا، جب ہم اس کا تقابل اس کی اس حالت سے کرتے ہیں۔ جو جاگیرداری کے تاریک دور میں اسے حاصل تھی تو صاف نظر آتا ہے کہ اشتراکیت نے اگر کسان کی حالت سدھاری نہیں بگاڑی ہے۔ ذرا غور فرمایئے اشتراکیت نے کسان کو کیا دیا۔

زمینوں سے محرومی

اشتراکیت سے پہلے کم از کم پچاس فیصد کسان ایسے تھے جو خود اپنی زمینوں کے مالک تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے اور وہ بھی تھے جن کے پاس نسبتاً کم چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی تھے مگر اشتراکیت کے بعد کوئی ایک کسان بھی ایسا نہ رہا جو ایک چپہ زمین کا بھی مالک ہو۔

مزارعوں کے استحصال میں زیادتی

وہ کسان جو زمینداروں کی زمین پر بطور مزارع کام کرتے تھے گو مختلف طریقوں سے زمینداروں کے استحصال کا شکار رہتے تھے مگر پھر بھی انہیں

یہ توقع ضرور رہتی تھی کہ اگر زمین میں پیداوار زیادہ ہو گی تو ہمارے حصّہ میں بھی نسبتاً کچھ زیادہ غلہ مل جانے کا امکان موجود ہے مگر اشتراکیت نے ان کی یہ موہوم امید بھی چھین لی۔ اب زمین کی پیداوار کے اضافہ اور اس کی کمی سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔ انہیں تو ہر حالت میں اتنا حصّہ ہی ملے گا جتنا بقدر ضرورت زندہ رہنے کے لیے انہیں کفایت کرے اس سے زیادہ ایک حبہ ان کے نصیب کا نہیں۔

بخشش و انعام سے نا اُمیدی

پہلے بخشش یا عطا یا کسی اور صورت میں بھی کچھ نہ کچھ سال میں مختلف مواقع پر زمیندار سے کسان کو ملتا رہتا تھا اب اشتراکیت کے بعد یہ سلسلہ قطعاً منقطع ہو گیا۔

جانوروں کی طرح دن رات محنت و مشقت

اشتراکیت سے پہلے کسان کو اپنے کام کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل تھی۔ جس طرح چاہتا اور اپنی استطاعت کے مطابق جتنا کر سکتا تھا کر لیتا تھا۔ اگر بہ تقاضائے بشری کسی وقت طبیعت کام کی طرف راغب نہ ہوتی تو اسے دوسرے وقت پر اٹھا رکھنے پر اس کے لیے کوئی پابندی نہ تھی۔ تکان و اضمحلال کے وقت اُسے آرام کی بھی پوری آزادی تھی۔ مگر اشتراکیت کی بدولت یہ تمام سہولتیں اس کے جرائم کی فہرست میں شمار ہونے لگیں۔ اب حال میں مقررہ کام مقررہ وقت میں پورا کرنا ہر کسان کے لیے لازمی ٹھہرا۔ معمولی سی کوتاہی پر بڑی سے بڑی سزا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ تکان کو کام چوری سے تعبیر کیا جانے

لگا۔ غرض کسان بے چارے کی اب تیلی کے بیل جیسی بھی وقعت نہ رہی۔

گھر کی پرسکون زندگی سے محرومی

پہلے بڑی سے بڑی محنت و مشقت کا کام کرنے کے بعد بھی کسان کا دل اس تصور سے مسرور رہتا تھا کہ اس کی اس محنت و مشقت کے صلہ میں اس کے بال بچے آرام سے زندگی گزاریں گے۔ تپتی زمین اور چلچلاتی دھوپ میں وہ صرف اس خیال سے جنت کا سرور محسوس کرتا تھا کہ اس کے بیوی بچے آرام سے ہیں مگر اشتراکیت نے اگر اس سے یہ دلی سکون بھی چھین لیا۔ اب اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر کی عورتیں بھی اس کی طرح مصیبتیں جھیلنے پر مجبور تھیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس زرعی فارم پر وہ خود کام کر رہا ہے اسی پر اس کی عورتوں کو بھی کام مل جائے۔ یہ تو حکومت کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جس سے جہاں چاہے کام لے۔ اسی طرح اشتراکیت نے کسان کے بچوں کو بھی گھر کی پرسکون زندگی سے محروم کر دیا۔ اب وہ بھی اپنے ماں باپ کی شفقتوں سے دور حکومت کی زیرِ نگرانی کسی کیمپ میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ غرض کسان بے چارے کی واحد پونجی یعنی خاندانی زندگی کا سکون و اطمینان بھی اشتراکیت کی بھینٹ چڑھ گیا اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ خاندانی زندگی کی خواہش کرنا تو اشتراکیت کی لغت میں رجعت پسندی ہے جو ایک ناقابلِ معافی جرم ہے۔

ناکارہ ضروریاتِ زندگی

اور اس تمام محنت و مشقت کا معاوضہ کسان کو کیا ملا۔ دو وقت کی روٹی، پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو برا بھلا مکان، یہ تھی وہ قیمت جو کسان

کی تمام قربانیوں کے بدلہ میں اس کو اشتراکیت کی طرف سے عطا کی گئی۔ اشتراکیت سے پہلے تو پھر بھی اسے پیٹ بھر کر اور مرضی کا کھانا مل جاتا تھا مگر اشتراکیت کے لنگر خانوں سے جو کھانا اُسے نصیب ہوا وہ روس کے وزیر اعظم کوسیجن کی زبانی سنیئے۔ کمیونسٹ پارٹی کی بائیسویں کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"سرکاری طعام خانوں میں کھانا بالعموم بے مزہ اور بے ذائقہ ہوتا ہے اور سروس بھی معیاری نہیں ہے۔ عوام کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے کے معاملہ پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تمام کارخانوں تعمیراتی کام کی جگہوں، حکومتی زرعی فارم اور تعلیمی اداروں میں گرم کھانا ملنا چاہیئے۔"

اسی طرح رہنے کے لیے جو جگہ کسان کو اشتراکیت سے پہلے میسر تھی اس میں کم از کم کسی دوسرے کا تو کوئی دخل نہ تھا لیکن اب کسان بے چارے کو سر چھپانے کے لیے وہ بیرکیں ملیں جن کے غسل خانے تک مشترک ہیں، جہاں نہانے کے لیے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ روس کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اشتراکی انقلاب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں روس میں شہری مکانی جگہ ۲ء۷ مربع میٹر تھی ۱۹۵۰ء میں بھی یہی رہی۔ ۱۹۵۷ء میں ۷ء۷ مربع میٹر ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں روس کے وزیر اعظم خروشیف نے تسلیم کیا کہ "رہائش کی جگہ کی قلت کا مسئلہ آج بھی شدید شکل میں موجود ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کی خون پسینے کی ساری کمائی فوج، طیارے، راکٹ اور

اسلحہ بنانے پر خرچ ہو رہی ہے۔ کسان اور مزدور بے گھر ہے تو ہوا کرے۔

قانونی چارہ جوئی سے مایوسی

اشتراکیت سے پہلے بے چارہ کسان اگر زمینداروں اور جاگیرداروں کے استحصال کا شکار ہوتا تھا، اُن کے ظلم وستم کا نشانہ بنتا تھا تو اپنا دُکھ درد اپنے بال بچوں اور اپنے اعزا و اقارب سے کہہ کر اپنا دل تو ہلکا کر لیتا تھا اور بعض حالات میں اپنے ظلم وستم کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی امید کا سہارا تو اُسے حاصل تھا مگر اشتراکیت کی بدولت بے چارہ کسان اپنے اس حق سے بھی محروم ہو گیا اپنا دُکھ درد کہے تو کس سے۔ اوّل تو خود بیوی بچے ماں باپ اعزا و اقارب سب اسی ظلم کا شکار ہیں جس کا وہ خود نشانہ ہے۔ دوسرے اشتراکیت کی جاسوسی کے جال نے ہر فرد کے گرد ایسے اپنے پھندے سخت کیے ہیں کہ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں ہر شخص دوسرے کے خلاف جاسوسی کر رہا ہے۔ ماں باپ تک اپنی اولاد کے خلاف اور اولاد اپنے والدین کے خلاف جاسوسی کرنے پر مجبور ہے۔ اگر کوئی جاسوسی نہیں کرتا تو اس کی اپنی جان کی بھی خیر نہیں ہے۔ ظلم کے خلاف اُف کرنا بھی رجعت پسندی میں شامل ہے اور رجعت پسندی کی سزا موت سے کم نہیں۔ جو شخص اپنے ساتھی کی زبان سے کوئی شکایت کا کلمہ سُن کر خاموش ہی رہے، حکام بالا کو اس کی اطلاع نہ دے وہ بھی اسی کی طرح مجرم ہے، اور رجعت پسند ہے، اس لیے سزا کا مستحق ہے۔ ایسی صورت میں بھلا کس کی مجال ہے کہ جاسوسی کے اہم فرض سے غافل ہو جائے۔ رہا حکام بالا کے خلاف چارہ جوئی تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انصاف مانگے تو کس سے۔ جن سے انصاف مانگا جا سکتا ہے

وہی تو اس ظلم کے مرتکب ہیں۔ دروازہ کھٹکھٹائے تو کس کا۔ جاگیر دار اور زمیندار اپنی تمام تر استحصالی قوتوں کے باوجود حکومت و اقتدار کے مالک تو نہ تھے اب بے چارے کسان پر جو نیا جاگیر دار مسلط ہوا ہے وہ اپنی سابقہ تمام طاقتوں کے ساتھ ساتھ حکومت و اقتدار کا بھی بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ قانون اس کی مٹھی میں ہے جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اشتراکی آمریت کے خلاف کسی کی مجال نہیں کہ آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ زبان کھولنا تو دور کی بات ہے۔ کسان بے چارے کی تو حقیقت ہی کیا ہے، اشتراکی آمر کے سامنے تو خود اس کے ساتھ حکومت میں شریک پارٹی ورکرز میں سے بھی کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اشتراکی آمر کے کسی عمل پر تنقید کر سکے۔ روس کے سابق وزیر اعظم خروشیف کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے اپنی ایک تقریر کے دوران جب سٹالن پر تنقید کی تو پارٹی ورکرز میں سے کسی نے ایک سلپ بھیجی جس پر یہ سوال درج تھا کہ آپ یہ باتیں ان کے سامنے کیوں نہیں کرتے تھے۔ خروشیف نے جواب دینے کے بجائے بآواز بلند پوچھا کہ جن صاحب نے یہ سلپ بھیجی ہے وہ ذرا کھڑے ہو کر بات کریں۔ جب بار بار کہنے پر بھی کسی میں کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی تو خروشیف نے ہنس کر کہا کہ ان کے سوال کا بس یہی جواب ہے گویا آج ان کو میرے سامنے بات کرنے کی جرأت نہیں اسی طرح اسٹالن کے سامنے مجھے بھی نہ تھی۔

غرض اس حقیقت سے انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ اشتراکیت نے کسان کو دیا کچھ نہیں اور چھین سب کچھ لیا ہے۔ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی بنا پر جو بیماری بے چارے کسان کو لگی تھی اشتراکیت اس کا علاج تو کیا کرتی

اس بیماری کو کئی گنا بڑھانے کا باعث ضرور بن گئی۔ دراصل اشتراکیت کا پہلا قدم ہی غلط اٹھا۔ کسانوں کے دکھوں کا یہ علاج تھا ہی نہیں کہ تمام زمینوں کو بلا تفریق قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ کسان کے تمام مصائب کی اصل وجہ زمین کی نجی ملکیت نہ تھی۔ اشتراکیت نے یہی سمجھا اور جب کسی بیماری کی تشخیص غلط ہو تو تجویز کا غلط ہونا یقینی ہوا کرتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کی تمام خرابیوں کی اصل وجہ زرعی قوانین کی وہ ناہمواری ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف بڑے بڑے جاگیردار جنم لیتے ہیں اور ان کی جاگیروں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اور دوسری طرف کسان بے چارہ روز بروز ان جاگیرداروں کے ہاتھ میں مجبور سے مجبور تر ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس صورت حال کی اصلاح کی جائے مگر اشتراکیت نے اس کے بالکل برعکس کسان کو پہلے سے بھی زیادہ بے دست و پا کر دیا اور جاگیردار کو پہلے سے بھی زیادہ طاقت و اختیار کا مالک بنا دیا۔ تمام چھوٹے بڑے جاگیرداروں کو ختم کر کے ایک ایسے عظیم جاگیردار کو جنم دیا جو ملک کی پوری زمین کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت و اقتدار کا بھی مالک تھا۔ نتیجہ سامنے ہے کہ کسان کی حالت سدھرنے کی بجائے بگڑتی چلی گئی اور کسان کی اصلاح کے تمام اشتراکی دعوے محض نقش بر آب ثابت ہوئے اس کے مقابلہ میں اسلام نے کسان کی اصل بیماری کو سمجھا، اس کے صحیح اسباب کو پہچانا اور پھر اس کے لیے ایسا علاج تجویز کیا جو پہلے ہی مرحلے میں اس کے لئے شفا کا پیغام لے کر آتا ہے۔

اشتراکیت نے کسان کے لیے جو کچھ کیا اس کا حال تو قارئین نے سطور

بالا میں ملاحظہ کر ہی لیا ہے۔ اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ اسلام کسان کی اصلاح کن خطوط پر کرتا ہے۔

اِصلاح کے تین بُنیادی اصُول

اِسلام کِسان کے لیے کیا کرتا ہے

کسان کی اصلاح کے لیے اِسلام نے جو تدابیر اختیار کی ہیں ان کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں اِسلام کے نقطۂ نظر کے بارے میں چند بُنیادی باتوں کی وضاحت کر دی جائے۔ کِسان کی حالت سدھارنے کی طرف قدم اُٹھانے سے پہلے ہمارے لیے ان حدود کا جاننا ضروری ہے جن کے اندر اسلام ہماری تمام اصلاحی تدابیر کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اِسلام کی نظر میں ان حدود سے تجاوز اصلاح نہیں فساد پیدا کرتا ہے۔

نجی ملکیّت کا ابطال فساد کی اصل بُنیاد ہے

اس سلسلہ میں اوّلاً تو یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نجی ملکیت کا ابطال اسلام کے نظامِ حیات میں کسی طرح درست بیٹھتا ہی نہیں۔ ذرائع پیداوار کو قومیانے کا تصوّر بنیادی طور پر اسلام کے پیش کردہ نظریۂ حیات کی عین ضد ہے۔ درحقیقت اسلام کا عدلِ اجتماعی زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو حکومت کی ملکیت میں دے دینے کو ہی تمام خرابیوں کی اصل جڑ قرار دیتا ہے۔ کیا یہ بات قرینِ انصاف ہے کہ حکومت کے کارندوں کا ایک مختصر سا گروہ تو ملک کے تمام ذرائع پر قابض ہو، کارخانے زمینیں سب اس کے تصرف میں ہوں،

ہر قسم کی ملکی تجارت کا وہ واحد اجارہ دار ہو اور اس کے ساتھ حکومت و اقتدار کا بھی وہ مالک ہو اور دوسری طرف تمام افراد معاشرہ اس کے غلاموں سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ دراصل یہ نظریہ ہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ اجتماعی بہبود کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو نجی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ اسلام تو اپنے مثالی معاشرہ کی تعمیر ایسی بنیادوں پر کرتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں عام افراد معاشرہ اپنی معیشت میں آزاد ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ذرائع پیداوار کو افراد ہی کے ہاتھوں میں باقی رہنے کو ضروری سمجھتا ہے۔

اسلام کسی ایک طبقہ کا وکیل نہیں

دوسری بنیادی بات جو کسان کی اصلاح کے سلسلہ میں مدنظر رہنا ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کسی ایک طبقہ کا وکیل نہیں ہے۔ وہ کسی مخصوص طبقہ کے اغراض و مفاد کی خاطر کسی دوسرے طبقے کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے کی کسی صورت اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی بنیاد عدل پر قائم ہے اس کے نظام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ آپ اصلاح کے نام پر یا اجتماعی بہبود کا نعرہ لگا کر جس سے جو چاہیں چھین لیں اور جس کو چاہیں عطا کر دیں۔ اسلام تو کسان کی اصلاح کے سلسلہ میں بھی یہی دیکھے گا کہ خدا کی شریعت کی رو سے کون کسی زمین کا جائز طور پر مالک ہے اور کس کی ملکیت ناجائز ہے۔ پھر جائز و ناجائز کی پوری تمیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام زمینوں کی ملکیت برقرار رکھے گا جو جائز شرعی حدود کے اندر رہ کر حاصل کی گئی ہوں گی اور ان تمام زمینوں کی

ملکیت کو کالعدم قرار دے گا جو ناجائز ذرائع سے اپنے قبضہ میں لائی گئی ہوں گی ۔

ملکیت زمین کے حصول میں جائز و ناجائز کی تفریق

تیسری قابلِ لحاظ بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ افرادِ معاشرہ کے پاس جو مال بھی آئے جائز ذرائع سے آئے اور جائز طریقے سے خرچ ہو۔ اس کے بعد اسلام ہم سے یہ ہرگز نہیں کہتا کہ تم فلاں فلاں قسم کے مال کے اس حد تک مالک ہو سکتے ہو اور اس سے زیادہ پر ملکیت کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ تم صرف اسی کاروبار کے مالک بن سکتے ہو جس کو براہِ راست تم خود کرتے ہو اور وہ کاروبار تمہاری جائز ملکیت میں نہیں آسکتا جو اُجرت پر یا شرکت کی صورت میں تم دوسرے کے ذریعہ کر رہے ہو۔ چنانچہ کسان کی اصلاح کرتے وقت اسلام ایسی کوئی پابندی نہیں لگاتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اتنے رقبہ کے قطعہ اراضی کا مالک ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ کسان کو اس بات کا بھی پابند نہیں کرتا کہ وہ صرف اس زمین کا مالک ہو سکتا ہے جو اس کی اپنی کاشت میں ہو اور وہ زمین جو اُجرت پر یا شرکت کے معاہدے پر کسی دوسرے سے کاشت کرا رہا ہو اس کی ملکیت میں نہیں رہ سکتی۔ اسلام کسان کو پورا اختیار دیتا ہے کہ وہ ناجائز ذرائع سے جتنی زمین چاہے اپنی ملکیت میں رکھے اور جس طرح چاہے اسمیں خواہ خود کاشت کرلے اور خواہ دوسروں سے جائز معاہدوں کے تحت کرائے۔

اصلاح کے لیے عملی تدابیر

ان بنیادی نکات کی وضاحت کے بعد اب دیکھئے کہ پاکستان کے موجودہ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسلام کسان کے تمام مصائب کا کیا حل تجویز کرتا ہے اور اس سلسلہ میں کیا اصلاحی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

(۱) وہ تمام زمینیں جو انگریزی حکومت نے بعض لوگوں کو اصل مالکوں سے چھین کر غداریوں کے صلہ میں عطا کی تھیں سب بحق سرکار ضبط کر لی جائیں گی۔ اسی طرح وہ زمینیں بھی جو انگریزی تسلط سے بھی پہلے مختلف زمانوں میں بے جا عطا اور بخشش کے ذریعہ موجودہ لوگوں کے آباؤ اجداد کو ملی تھیں سرکاری ملکیت قرار پائیں گی۔ ایسی تمام زمینیں مستحق، غریب کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔

(۲) ایسی تمام زمینیں جن کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ان پر کس کی ملکیت کس طرح شروع ہوئی اور آیا وہ ملکیت شریعت کی رو سے جائز بھی ہے یا نہیں ان کے لیے محض ایک اصلاحی اقدام کے طور پر ملکیت کی ایک عارضی حد مقرر کر دی جائے گی۔ اس حد سے زائد تمام زمینیں مالکوں سے منصفانہ شرح پر حکومت خرید لے گی اور ایسے کاشت کاروں کے ہاتھ مناسب شرح پر فروخت کر دے گی جو پہلے کسی زمین کے مالک نہیں ہیں۔ یہ فروخت آسان اقساط کی صورت میں بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے تاکہ کاشت کار بہ سہولت وہ زمینیں خریدنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ قدم محض ایک عارضی تدبیر کے طور پر اٹھایا جائے گا اور ملکیت زمین کی یہ حد بندی صرف اس وقت تک نافذ رہے گی جب تک زمینوں کی ملکیت کی موجودہ ناہمواری دور نہیں ہو جاتی کیونکہ اسلام کے نظام معیشت میں جیسا کہ

اوپر وضاحت کی گئی ہے اس کی گنجائش ہی نہیں کہ کسی بھی قسم کی مستقل حد بندی کسی کاروبار پر عائد کی جائے خواہ وہ از قسم صنعت و تجارت ہو یا از قسم زراعت۔

(۳) وہ زمینیں جو سرکاری افسروں نے اپنی سرکاری حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حاصل کر لی ہیں وہ سب بھی بحق سرکار ضبط کر کے زمین سے محروم کسانوں کو دیدی جائیں گی۔

(۴) ایسی نئی زمینیں جو آئندہ کاشت کے قابل بنائی جائیں گی وہ ایسے ہی کسانوں کو دی جائیں گی جن کے پاس پہلے سے کوئی قطعہ اراضی نہیں ہے۔

(۵) جو زمینیں تین سال کی مدت تک کاشت میں نہ لائی جائیں اور بے کار پڑی رہیں وہ بھی ان کے مالکوں سے واپس لے کر ایسے مستحق کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی جو انہیں زیر کاشت لا سکیں۔

(۶) ایسے قوانین نافذ کیے جائیں گے جن کے ذریعہ یہ ضمانت حاصل ہو سکے کہ کسان اور زمیندار کا تعلق دو برابر کے معاہد فریق جیسا ہو گا۔ آقا اور غلام کے تعلق کی سی صورت پیدا نہ ہو گی۔ زرعی جائدادوں کی خرید و فروخت پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو گی۔ زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی تفریق مٹ جائے گی۔

(۷) ایسی عدالتیں قائم کی جائیں گی جو اس بات کا خیال رکھیں گی کہ کسان اور زمیندار کے درمیانی معاملہ خواہ زراعت کی شکل میں ہو یا اجرت کی صورت میں انصاف کی بنیادوں پر ہو رہا ہے۔ وہ عدالتیں اس بات کا انتظام بھی کریں گی کہ زمیندار اپنے کاشت کار سے بیگار نہ لے سکے۔ صرف اسی حصے کا حقدار

ہو جو معاہدے کی رو سے طے پایا ہو۔

(۸) اس بات کا سرکاری طور پر انتظام کیا جائے گا کہ زرعی پیداوار کا عشر اور مواشی وغیرہ پر زکوٰۃ زمینداروں سے باقاعدہ وصول کی جائے اور دیگر مصارف زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ ان کسانوں کی حالت سدھارنے پر خرچ ہو جو فقرار اور مساکین کے زمرہ میں آتے ہیں۔

یہ ہیں وہ تدابیر جن کے ذریعے اسلام کسان کی تمام بیماریوں کا علاج کرتا ہے اور اُسے معاشرہ میں ایک باعزت مقام عطا کرتا ہے۔ اسلام کی ان اصلاحی تدابیر کے نتیجے میں یہی نہیں کہ جاگیردارانہ نظام کی تمام برائیاں دور ہو جاتی ہیں بلکہ آئندہ بھی کسی نئی بیماری کے پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ اب ذرا تقابل کر کے دیکھئے، کسان کے دو ہمدرد ہیں۔ سوشلزم اور اسلام۔ دونوں کو کسان کی حالت سدھارنے کا دعویٰ ہے۔ دونوں کو اس بیماری کے علاج کی فکر ہے جس نے کسان کو زندہ درگور کر رکھا ہے۔ مگر واقعات اور دلائل نے ثابت کر دیا کہ سوشلزم کے علاج سے صحت یابی کے بجائے کسان کی بیماری اور بڑھ گئی۔ صحیح علاج حقیقت میں وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے اور اسی کے ذریعہ صحت یابی ممکن ہے۔
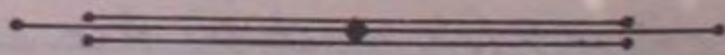
سوشلزم اور جمہوریت

جو لوگ اشتراکی معاشی نظام کو بروئے کار لانے کے علمبردار ہیں اور ساتھ ہی جمہوریت کے نفاذ کو بھی اپنی منزل بتلاتے ہیں وہ یا تو خود احمقوں کی جنت میں بستے ہیں یا اپنے مخاطبین کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ معمولی سمجھ بوجھ سے بھی بالکل عاری ہیں کیونکہ اشتراکیت اور جمہوریت دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان دونوں کے اتحاد کی باتیں کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آگ اور پانی کو یکجا کر دینے کا دعویٰ کرے۔ جہاں اشتراکیت کا نظام نافذ العمل ہوگا وہاں لازمی نتیجہ کے طور پر آمریت کا مسلط ہو جانا یقینی ہے۔ آمریت کے بغیر اشتراکیت کا معاشی نظام ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔

اشتراکیت اور آمریت لازم و ملزوم ہیں

یہ حقیقت کہ اشتراکیت اور آمریت دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں تھوڑے سے غور و فکر سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے یہ امر واقعہ ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کا مرکزی محور اور بنیادی نقطۂ نظر اجتماعی ملکیت کا وہ اصول ہے جس کے تحت تمام ذرائع پیداوار حکومت کے تصرف و اختیار میں دے دیئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح ملک کی پوری

معاشی طاقت افراد کے ہاتھوں سے نکال کر حکومت کی انتظامیہ کے چند کارندوں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اس حقیقت سے بھی کسی کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتی کہ افراد سے معاشی طاقت کا سلب کر لینا متلزم ہے اس بات کو کہ ان کے ہاتھوں سے سیاسی طاقت بھی سلب کر لی جائے یا اُسے کم از کم بے انتہا کمزور اور غیر مؤثر بنا دیا جائے اور یہ بات جمہوریت کی روح کچل دینے کے مترادف ہے۔ موجودہ صنعتی دور میں کسی معاشرہ کی تعمیر میں معیشت کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی آزادانہ رائے رکھنے، اس کے اظہار اور اپنے نقطۂ نظر کے حق میں منظم جدوجہد کرنے کی خاطر معاشی طاقت لازمی طور پر افراد کے ہاتھوں میں رہے۔

جمہوریت کی بنیادوں پر اگر نظامِ حکومت چلانا مطلوب ہے تو ضروری ہے کہ افراد کو اپنی آزادانہ رائے رکھنے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔ ہر فرد کو یہ حق ہو کہ وہ آئین کی حدود میں رہتے ہوئے حکومت کی پالیسیوں سے اختلاف کر سکے اور اپنے اختلاف کے اظہار کے لیے اور اس کو مؤثر بنانے کی خاطر مناسب ذرائع سے کام لے سکے۔ اگر معاشرہ کے اکثر افراد حکومت کی پالیسی کو کسی موقعہ پر غلط سمجھ رہے ہوں تو انہیں اس قسم کے مواقع حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ حکومت کے فیصلہ پر اثر انداز ہو سکیں اور اُسے رائے عامہ کے مطابق تبدیل کروا سکیں۔ جمہوریت کی روح اس بات کی بھی متقاضی ہے کہ افراد کو حکومت کی انتظامیہ پر کڑی نگرانی رکھنے کا حق بھی حاصل ہو، وہ جب چاہیں عمّالِ حکومت کا احتساب کر سکیں اور اگر ضرورت پڑے تو ان پر سخت سے سخت تنقید بھی کر سکیں

اور بالآخر وہ اگر ان کو بدلنا چاہیں تو اس کے مواقع بھی انہیں حاصل ہوں۔

جمہوریت کے یہ تمام تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک معاشی طاقت افراد کے ہاتھوں میں نہ ہو۔ جب تمام ذرائع پیداوار حکومت کے چند کارندوں کے قبضۂ اختیار میں ہوں گے تو ظاہر بات ہے کہ معاشرہ کے دیگر تمام افراد ان کارندوں کے تنخواہ دار ملازم سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھیں گے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر فرد کو اپنی روزی کی خاطر ان کے خم ابرو کا تابع رہنا پڑے گا۔ کیونکہ جس خزانہ پر ان افراد کی روزی کا انحصار ہوگا اس کی کنجیاں انہیں کارندوں کے ہاتھوں میں ہوں گی۔ ایسی صورت میں حکومت کے ان کارندوں کے لیے یہ بات بڑی آسان ہوگی کہ وہ جس فرد میں بھی اختلاف کی ذرا بو سونگھیں اس کے پیچھے پڑ جائیں اور اُسے ستانا شروع کر دیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیشتر افراد معاشرہ اختلاف رائے کی جرأت ہی نہ کر پائیں گے۔ کیونکہ تمام ذرائع پیداوار حکومت کے ان کارندوں کے ہاتھ میں ہوں گے تو ان کے لیے یہ بہت آسان ہوگا کہ وہ اختلافی رائے کے اظہار کے مواقع ہی یکسر ختم کر دیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اختلاف رکھنے والوں کو معاشی مشکلات میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں اور اظہار رائے کے مواقع اور نشر و اشاعت کے ذرائع پر قسم قسم کی قدغنیں لگا کر بھی اپنی مطلب برآری کر سکتے ہیں۔ اور یہ بات بھی ذرا غور طلب ہے کہ جب تمام ذرائع پیداوار ہی ان معدودے چند عمّال حکومت کی ملکیت میں آگئے تو دوسری صنعتوں کی طرح ذرائع نشر و اشاعت اور وسائل نقل و حمل بھی تو انہی کے قبضۂ و اختیار میں چلے جائیں گے اور اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں

کہ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرے، عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے اور اصلاح احوال کے لیے منظم طور پر جدوجہد کرنے کے لیے ان ذرائع و وسائل کا استعمال ضروری و لابدی ہے اگر یہ عمّال حکومت افراد کو ان ذرائع نشر و اشاعت اور وسائل نقل و حمل سے آزادانہ طور پر فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہ دیں تو اظہار اختلاف کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے اور جمہوریت کا یہ تقاضہ کیسے پورا ہو سکتا ہے۔

اشتراکیت کا نفاذ جمہوریت کی موت ہے۔

یہ بات کہ اشتراکیت جمہوریت کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے محض تخمینوں کی بنیاد پر نہیں کہی گئی۔ اشتراکی ممالک کا حال اس پر شاید ناطق ہے۔ اشتراکیت نے جس جس ملک میں بھی قدم جمائے وہاں جمہوریت کا لفظ عملی طور پر لغات ہی سے خارج ہو کر رہ گیا۔ کسی بھی اشتراکی ملک کو لے لیجیے ہر ملک کے سیاسی نظام میں حکومت کے چند کارندے ہی ساری طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ پورے ملک میں صرف ایک پارٹی ہوتی ہے۔ یہی پارٹی انتخابات کا ڈھونگ بھی رچاتی ہے۔ ہر حلقۂ انتخاب سے اسی کے نمائندے کھڑے ہوتے ہیں۔ مقابل میں کوئی دوسرا امیدوار ہوتا ہی نہیں اس لیے بڑی شان سے سو فی صد ووٹوں سے کامیاب ہوتے ہیں۔ ملک کا پورا نظام خفیہ پولیس کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ حکومت کی انتظامیہ سے معمولی سا اختلاف بھی قوم کے بڑے سے بڑے آدمی کو جیل پہنچا دینے کے لیے کافی ہے۔ پریس۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور خبر رساں ایجنسیاں غرض عوام تک ملک کی صحیح صورت حال پہنچانے کے تمام ذرائع حکومت کے قبضے

میں ہوتے ہیں۔ وہ جو خبر جس طرح چاہے عوام تک پہنچائے اور جس خبر کو چاہے صیغۂ راز میں رکھے۔ اختلاف رائے کے اظہار کی ہر صورت قانونی طور پر ممنوع ہوتی ہے۔ جلسہ کرنا جلوس نکالنا حکومت سے بغاوت کے مترادف ہوتا ہے۔ کوئی پریس آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو آپ کا ایک ہینڈبل ہی چھاپ دے۔ کوئی اخبار آپ کا اختلافی بیان چھاپنے کے لیے مرتے دم تک آمادہ نہ ہوگا۔ احتجاجی مظاہرے اور ہڑتالوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آزادی تحریر و تقریر پر اس قدر جبر و اکراہ کے نتیجے میں چونکہ ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں لوگ اس تشدد سے تنگ آکر اندر ہی اندر حکومت کے خلاف سازشیں نہ شروع کر دیں اس لیے ہر فرد پر جاسوسی پہرہ بٹھانا پڑتا ہے۔ ہر فرد کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہم و گمان اور شکوک و شبہات کی بنیاد پر بڑی بڑی تطہیری مہمیں چلائی جاتی ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے لاکھوں انسانوں کو "حفاظت انقلاب" کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان شکوک و شبہات کی لپیٹ سے خود سوشلسٹ پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر بھی محفوظ نہیں رہتے۔ ابھی ماضی قریب میں خروشیف اور لیو شاؤچی کا جو عبرت ناک انجام ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

اشتراکی ممالک میں ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا قیام ممنوع ہے

اس سلسلہ میں یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ کسی ملک کے سیاسی نظام کے جمہوری تقاضوں میں سے ایک بڑا تقاضا یہ ہے کہ ملک میں ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیاں موجود ہوں تاکہ ان کے نظریات کے تقابل سے ملکی

ترقی کی نئی نئی راہیں سامنے آئیں اور عوام کے ذہنوں کو بُرے بھلے کے پرکھنے کی تربیت ملے۔ جمہوریت کے پنپنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں جو بھی سیاسی پارٹی برسرِ اقتدار ہو اُسے ہر ہر قدم پر تنقید اور احتساب کا خوف دامن گیر رہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملک میں ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا وجود نہ ہو۔ غرض ایک سے زیادہ پارٹیوں کا وجود جمہوریت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اشتراکی ممالک میں خواہ وہ سوویٹ روس ہو یا کمیونسٹ چین، چیکو، سلوویکیہ ہو یا پولینڈ، ہنگری، رومانیہ، البانیہ اور بلغاریہ ہو یا مشرقی جرمنی اور منگولیا، شمالی کوریا ہو یا کیوبا اور شمالی ویت نام ہو کہیں بھی ایک سے زیادہ سیاسی پارٹی موجود نہیں۔ یہی نہیں کہ ان ممالک میں محض ایک سیاسی پارٹی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ممالک کے اقتدار کی باگ دوڑ ہے بلکہ تمام اشتراکی ممالک میں کسی دوسری پارٹی کی بنیاد ڈالنا قانونی طور پر جرم ہے۔ کمیونسٹ کے علاوہ دیگر خود مختار اشتراکی ممالک کی سیاسی صورتِ حال بھی بعینہٖ یہی ہے۔ مصر کی عرب سوشلسٹ یونین، شام کی بعث پارٹی اور یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی نے ظلم و تشدد کرنے اور آزادیٔ رائے کا گلا گھونٹنے میں بالکل وہی کردار ادا کیا جس کا مظاہرہ دوسری کمیونسٹ پارٹیوں نے کیمونسٹ بلاک میں شامل ممالک میں کیا ہوا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اخوان المسلمون کے ساتھ جو کچھ مصر میں ہوا دنیا اس سے بخوبی واقف ہے اخوان المسلمون کے بڑے بڑے رہنماؤں کو جس طرح شدید اذیتیں دی گئیں اور کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر جس طرح انکو پھانسی کے تختہ پر چڑھا کر جمہوریت

کا خون کیا گیا دنیا نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ ۱۹۶۸ء
میں اسکندریہ میں طلبار کے احتجاجی مظاہروں کو جس طرح مشین گنوں کی اندھا
دھند فائرنگ سے دبانے کی کوشش کی گئی وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں
ہے۔ غرض کسی ایک بھی ایسے اشتراکی ملک کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جہاں اقتدار
پر قابض کسی ایک تن تنہا پارٹی نے پورے ملک میں جمہوری تقاضوں کا گلا نہ
گھونٹ رکھا ہو۔ پاکستان کے اشتراکی حضرات جو دوسرے اشتراکی ممالک کی
نام نہاد کارگزاریوں کا حوالہ دیتے نہیں تھکتے ذرا بتلائیں کہ اشتراکی لغت میں کیا
جمہوریت اسی کا نام ہے اور کیا وہ بھی اسی قسم کی جمہوریت لانے کا پروگرام
بنا رہے ہیں۔

ملک میں صرف ایک پارٹی کے ہونے اور کسی دوسری پارٹی کے قیام
کو قانونی طور پر جرم قرار دینے کے جواز میں اشتراکی قائدین کہا کرتے ہیں کہ چونکہ
اشتراکی ریاست پرولتاریوں اور معاشرہ کے دوسرے طبقوں کے درمیان کشمکش
کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے اس لیے اشتراکی ریاست نظریاتی طور پر اس بات
کی متحمل ہی نہیں ہے کہ کسی ایسی دوسری پارٹی کا وجود برداشت کرے جو مخالف
اشتراکیت نظریات کی حامل ہو۔ قطع نظر اس سے کہ اشتراکی قائدین کا یہ استدلال
کس حد تک درست ہے ہمیں تو اشتراکی حضرات سے یہ پوچھنا ہے کہ ان کے
اس فرمان سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اشتراکی ریاست میں کسی غیر اشتراکی نظریات
رکھنے والی پارٹی کو برداشت نہیں کیا جا سکتا مگر اس صورت حال کی ان کے پاس
کیا توجیہہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں کسی ایسی پارٹی کا وجود بھی برداشت نہیں کیا

جاتا جو بنیادی طور پر تو اشتراکی نظریات ہی کی حامل ہو مگر طریق کار میں حکومتی پارٹی سے اختلاف رکھتی ہو یا کسی خاص معاملہ میں حکومتی پارٹی کی پالیسی سے متفق نہ ہو۔

چند تاریخی حقائق

کیا اشتراکی حضرات اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ فروری ۱۹۱۷ء میں زار روس کے خلاف انقلاب برپا کرنے والوں میں جو پارٹیاں سب میں پیش پیش تھیں ان میں مینشویک (Mensheviks) اور سوشلسٹ انقلابی پارٹی (Socialist Revolutioneries) کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ انقلاب فروری کے بعد جو عارضی حکومت بنی اس میں بھی تمام تر اکثریت ان ہی دو پارٹیوں کو حاصل تھی۔ بالشویک (Bolshe-viks) جو بعد میں انقلاب اکتوبر کے ہیرو بنے اس حکومت میں صرف دو ممبروں کی نمائندگی سے شامل تھے۔ (تاریخ انقلاب اکتوبر صفحہ نمبر ۲۲) کیا مینشویک اور سوشلسٹ انقلابی پارٹیاں اشتراکی نظریات کی حامل نہ تھیں پھر کیا وجہ ہے کہ بالشویک پارٹی نے اقلیت میں ہونے کے باوجود ان دو اکثریتی اشتراکی پارٹیوں کے خلاف اکتوبر ۱۹۱۷ء میں علم بغاوت بلند کیا۔ کیا ان دو پارٹیوں کا اس کے علاوہ بھی کوئی قصور تھا کہ وہ اشتراکی نظام کو جمہوری بنیادوں پر چلانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

یہ الزام لگا دینا تو بہت آسان ہے کہ مینشویک اور سوشلسٹ انقلا نے عوام کے مفاد کے خلاف بورژوا طبقہ سے ساز باز کر رکھی تھی مگر

کا جھٹلانا بہت مشکل ہے۔ کیا روسی مورخین اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ انقلاب فروری کے بعد جب سوویٹ کارکنوں کے نمائندوں کی عارضی انتظامیہ کمیٹی نے مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں سے اپنے اپنے نمائندے منتخب کرنے کی درخواست کی تو انتخابات کے نتیجے میں غالب اکثریت انہی دو پارٹیوں کو حاصل ہوئی اگر ان دو پارٹیوں کو اپنے عوام کے مفاد کے خلاف بورژوا طبقہ سے ساز باز کرتی تھی تو عوام نے ان دو پارٹیوں کو اپنے ووٹ کیوں دیئے۔ روسی مورخین اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ۱۹۱۷ء کے موسم گرما تک صوبائی علاقوں اور صنعتی مراکز میں سوویٹ کارکنوں کے کل ۴۰۰ نمائندے تھے۔ ان میں سے معدودے چند کو چھوڑ کر جو بالشویک پارٹی سے تعلق رکھتے تھے سب کے سب مینشویک پارٹی اور سوشلسٹ انقلابی پارٹی کے پلیٹ فارم سے منتخب ہو کر آئے تھے۔

(History of the October Revolution. P. 28.) اگر یہی

صورتِ حال برقرار رہتی تو آج روس کی تاریخ مختلف ہوتی۔ روسی عوام جمہوریت کی دولت سے مالا مال ہوتے۔ مگر جب لینن کو جو اس وقت ملک سے باہر تھا انقلابِ فروری کی خبر پہنچی اور یہ معلوم ہوا کہ انتہا پسند بالشویک پارٹی کو حکومت میں بہت معمولی نمائندگی نصیب ہوئی ہے تو اس نے فوراً ملک کا رخ کیا اور آتے ہی خالص اشتراکی انداز میں اور قطعی غیر جمہوری طور پر بغاوت کی ایک سرنگی سازش تیار کی۔ ایک طرف اس نے بالشویک تخریب پسندوں کے ذریعہ جو پہلے سے روسی فوج میں موجود تھے روس کے فوجی دستوں سے رابطہ پیدا کیا۔ اس زمانہ میں پہلی عالمی جنگ جاری تھی اور مسلسل جنگ و جدل سے روسی فوجی سپاہی

تنگ آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے سپاہیوں سے وعدہ کیا کہ اگر تم لوگوں نے بالشویک مجوزہ انقلاب کا ساتھ دیا تو تمہیں فوراً واپس گھروں کو چلے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ دوسری طرف لینن نے مزدوروں کے مسائل کو ہوا دے کر ان کو احتجاجی مظاہروں اور ہڑتالوں پر اُبھارا۔ ان سے بڑے بڑے وعدے کیے۔ ان کو کارخانوں کا مالک بنا دینے کا لالچ دیا۔ اور تیسرا کام اس سلسلہ میں لینن نے یہ کیا کہ بالشویک خیالات رکھنے والے جتنے لوگ بھی تھے ان میں چپکے چپکے اسلحہ تقسیم کر دیا۔ اس طرح لینن نے ابتدا ہی سے اس نظریہ کی بنیاد پر کام شروع کیا کہ سیاسی طاقت کے حصول کے لیے عوام کی حمایت کی نہیں بلکہ مسلح قوت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور سوچنے کا یہی وہ انداز ہے جو جمہوریت کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے مگر اشتراکیت کا امتیازی نشان ہے۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بالشویک نے خونیں انقلاب برپا کیا اور اگلے روز ہی وہ روسی اقتدار کے بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ حکومت کو گمان تک نہ تھا کہ ان کے اشتراکی بھائی جو خود بھی حکومت میں شامل ہیں اپنے ساتھیوں کے خلاف بغاوت کر دیں گے اس لیے بالشویک بڑی آسانی سے مینشویک اور سوشلسٹ انقلابی پارٹیوں کو اقتدار سے محروم کرنے اور خود اس پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کے دن روس میں اشتراکیت اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو گئی۔ گویا یہ دن روس میں اشتراکیت کی تاریخ کا پہلا دن تھا۔ اور اسی دن سے روس میں آمریت کا دور شروع ہو گیا اور جمہوریت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دیس نکالا مل گیا۔ انقلاب سے اگلے ہی روز یعنی ۲۶ر اکتوبر کو پیٹرو گراڈ انقلابی فوجی کمیٹی کی

جانب سے تمام غیر انقلابی اخباروں کو مکمّا بند کرا دیا گیا اور قارئین کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ ان غیر انقلابی اخباروں میں وہ اخبار بھی شامل تھے جو نظریاتی اعتبار سے تو اشتراکی ہی تھے مگر لینن کی پالیسی سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ انقلاب فروری کے بعد روس میں جو جمہوریت کے آثار بیدار ہونے شروع ہوئے تھے روسی عوام میں ابھی ان کا احساس باقی تھا۔ ان اخبارات کی جبری بندش پر کچھ احتجاج بلند ہوا تو لینن نے اس موقعہ پر جو کچھ کہا وہ ان لوگوں کے لیے جو اشتراکیت کے ساتھ ساتھ جمہوریت کا نعرہ بلند کرتے ہیں مرقع عبرت ہونے کے علاوہ اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ لینن نے اپنے ان الفاظ میں اشتراکیت کے سیاسی خمیر کا پتہ دے دیا ہے۔ لینن نے کہا۔

> "ان اخبارات کو برداشت کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم خود اپنے اشتراکی ہونے کی نفی کر دیں۔ ہم اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ بورژوا طبقہ کو اپنے آپ پر تنقید کرنے کا موقع فراہم کریں۔"

(V. I. Lenins, *The collected works*. Vol. 26, P. 285.)

یہ بات کہ اشتراکیت اور آمریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں لینن نے ایک اور موقعہ پر کہی ہے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۱۷ء کو جب کیڈٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور اس کے ان رہنماؤں کو جو قانون ساز اسمبلی کے ممبر تھے عوام دشمنی کے مبہم الزام پر گرفتار کیا گیا تو خود بالشویک رہنماؤں نے لینن کے اس قطعی غیر جمہوری اقدام کو ناپسند کیا۔ ان رہنماؤں میں کیمانوف، ریکوف اور ریازنیوف جیسے بڑے بڑے بالشویک لیڈر شامل تھے۔

لیکن لینن نے اس وقت جو بیان دیا اس کا یہ فقرہ اشتراکیت کے سیاسی نظریہ کی بالکل صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس نے کہا۔

"سوویٹ ریپبلک کی جمہوریت سے مراد ریاست کا ایسا نظام ہے جو پرولتاری عوام کی آمریت پر مبنی ہو اور یہ جمہوریت کی ایک اعلیٰ شکل ہے" (Ibid. P. 327)

یہ پرولتاری عوام کی آمریت بھی جسے روسی مورخین عوامی جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں ہمارے ایوبی دور کی بنیادی جمہوریت سے کوئی دو ہاتھ آگے ہی ہے۔ بے چارے پرولتاری عوام کا تو محض نام ہی استعمال ہوتا ہے۔ ورنہ تمام اختیارات اشتراکی آمر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ انتخابات محض ایک ڈھونگ ہوتے ہیں نمائندے صرف وہی منتخب ہوتے ہیں جن کو اشتراکی آمر پہلے سے منتخب کرلے پھر ایسے نمائندوں کی اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ اشتراکی آمر کی ہر بات پر صاد کرتے رہیں۔ کسی نے ذرا نگاہ اٹھا کر دیکھا نہیں اور عوام دشمنی کے الزام سے شرف یاب ہوا نہیں۔ اور یہ عوام دشمنی ایسا جرم ہے کہ اس کی آڑ میں اور حفاظت انقلاب کے نام پر اشتراکی آمر جو سزا بھی ایسے جرم کو دے وے کم ہے۔ ایسی صورت میں کسی میں یہ جرأت کہاں کہ اشتراکی آمر کی کسی بات سے اختلاف کرسکے۔ خروشیف کا مشہور واقعہ ہے کہ اسٹالن کے مرنے کے بعد اس نے ایک اجلاس میں سٹالن کی پالیسیوں پر سخت تنقید کی۔ اجلاس میں سے کسی نے ایک چٹ بھیجی جس پر لکھا تھا کہ آپ یہ باتیں ان کے سامنے کیوں نہیں کہتے تھے۔ خروشیف نے بلند آواز میں کہا کہ جن صاحب نے یہ سلپ بھیجی ہے۔

وہ کھڑے ہو کر بالمشافہ سوال کریں۔ جب بار بار کہنے کے باوجود کسی شخص میں کھڑے ہونے کی ہمّت نہ ہوئی تو خروشیف نے ہنس کر کہا کہ ان کے سوال کا بس یہی جواب ہے۔ یعنی جس طرح آج انہیں میرے سامنے کھڑے ہو کر بات کرنے کی جرأت نہیں ہے اسی طرح مجھے بھی اسٹالن کے سامنے اس کی پالیسیوں پر تنقید کرنے کا یارانہ تھا۔

غرض اس بات میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ اشتراکیت کے ہوتے ہوئے جمہوریت کا خواب تک نہیں دیکھا جا سکتا۔ اشتراکیت کا ہر قدم آمریت کی طرف اٹھتا ہے اگر کسی ملک میں جمہوریت پہلے سے موجود بھی ہو یا کوئی ملک اشتراکیت کے ساتھ ساتھ جمہوریت کو باقی رکھنے کا عزم رکھتا ہو تو حالات خود بخود ایسا رُخ اختیار کر لیں گے کہ جمہوری اقدار مردہ ہوتی چلی جائیں گی اور آمریت کے نقوش فطری طور پر ابھرتے چلے آئیں گے۔ روس ہی پر موقوف نہیں چین کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے اور ایسا ہی حال دوسرے تمام اشتراکی ممالک کا ہے۔ چین کی جو صورت حال ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے ایک طرف ہم چیئرمین ماؤزے تنگ کا یہ قول پڑھتے ہیں کہ:۔

"کمیونسٹ پارٹی تنقید سے نہیں ڈرتی کیونکہ ہم مارکس ہیں اور سچائی ہماری جانب ہے۔"

(Quotations from Chairman Mao-Tse-Tung. P. 258)

دوسری طرف ماؤزے تنگ ہی کے حکم سے ثقافتی انقلاب کے پانچ بڑے رہنماؤں کو محض اس جرم پر یک بینی و دوگوش نکال باہر کیا جاتا ہے کہ

انہوں نے چیئرمین ماؤزے تنگ کے کسی قول کو معنی باالفاظ کے لحاظ سے بگاڑا کیوں تھا۔ چینی کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا وہ سرکلر اس وقت ہمارے سامنے ہے جو ۱۶ رمئی ۱۹۶۶ء کو جاری کیا گیا ہے اور جس میں ان پانچ بڑوں کے خلاف الزامات کی فہرست دی گئی ہے۔ اس میں متذکرہ بالا فردِ جرم کے علاوہ ایک الزام یہ بھی ہے کہ ثقافتی انقلاب کے ان پانچ بڑے رہنماؤں نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ "سچائی کے سامنے ہر شخص برابر ہے۔" اس رپورٹ میں آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ یہ نعرہ بورژوائی نعرہ ہے اور ایک اشتراکی ریاست میں اس نعرہ کو کسی طور پر برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ (Ibid. P. 6)

قارئین نے ملاحظہ کیا کہ ایک طرف یہ دعویٰ کہ ہم تنقید سے نہیں ڈرتے اور دوسری طرف یہ حال کہ کسی نے اختلاف کے لیے زبان کھولی نہیں اور فرد جرم عائد ہوئی نہیں۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اشتراکیت کا مزاج اسی کا متقاضی ہے اگر آمرانہ طرزِ روش اختیار نہ کیا جائے تو اشتراکی انقلاب کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی قائدین کی تحریروں اور تقریروں میں آمرانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کے جواز میں ہمیشہ حفاظتِ انقلاب کے تصور کو نہایت نمایاں مقصد کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت اور آمریت میں چولی دامن کا ساتھ ہے

بہرحال اس حقیقت کو مانے بغیر چارہ نہیں کہ جہاں کہیں اشتراکی نظام نافذ العمل ہوگا وہاں لازمی نتیجہ کے طور پر آمریت کا مسلط ہو جانا یقینی ہے اور اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اشتراکی نظام میں اجتماعی ملکیت کے اصول

کی بنا پر ملک کی پوری معاشی طاقت افراد کے ہاتھوں سے نکل کر حکومت کی انتظامیہ کے چند کارندوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور پوری قوم ان کارندوں کی تنخواہ دار ملازم بنکر رہ جاتی ہے۔ جمہوریت کے تقاضے صرف اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب معاشرہ میں افراد کی ایک کثیر تعداد اپنی معاش کے حصول میں حکومت کی محتاج نہ ہو۔ اس کی دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے کپڑے کا انحصار حکومت کے خزانے سے چلنے والی تنخواہ یا وظیفہ پر نہ ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب افرادِ معاشرہ کو اپنی معاش کے حصول کے مواقع آزادانہ طور پر میسّر ہوں اور افراد پیدائش دولت کا کاروبار حکومت کا دست نگر ہوئے بغیر جاری رکھ سکتے ہوں۔ جمہوری طرز حکومت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ملک کی سیاسی طاقت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کے بجائے افرادِ معاشرہ کی ایک کثیر تعداد کے ہاتھوں میں رہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اس قابل نہ ہوں کہ معاشی طور پر حکومت وقت سے بے نیاز ہو کر بھی زندہ رہ سکیں اور ترقی کی منازل طے کر سکیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ افرادِ معاشرہ معاشی طور پر حکومت کے دست نگر بھی ہوں اور اس کے خلاف کسی سیاسی طاقت کے حامل بھی ہوں۔ معاشرہ میں ذرائع پیداوار کا اجتماعی ملکیت سے باہر ہونا اور کسبِ معاش کے مواقع کا حکومت کے قبضہ و اختیار سے آزاد ہونا ہی اس بات کی ضمانت ہو سکتا ہے کہ اکثر افراد اپنی رائے آزادانہ طور پر قائم کرنے میں خود مختار ہوں اور اس کا برملا اظہار کر سکیں۔ اور یہ دونوں باتیں جمہوری طرزِ حکومت کیلئے روح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جمہوری طرز حکومت میں یہ روح اسی وقت پھونکی

جا سکتی ہے جب حکومت وقت کا کوئی ملازم، قومی صنعتوں میں کام کرنے والا کوئی مزدور یا ملکی زراعت کو پروان چڑھانے والا کوئی کسان اگر کسی وقت حکومت کی کسی پالیسی سے اتفاق نہ رکھتا ہو اور اس کے نفاذ میں تعاون کرنے کو درست نہ سمجھتا ہو تو وہ حکومت کی نوکری چھوڑ کر نجی کاروبار کے دائرہ میں اپنی روزی حاصل کرنے کے مواقع تلاش کر سکتا ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ذرائع پیدائش دولت حکومت کے قبضہ و اختیار سے باہر نہ ہوں۔ اشتراکی معاشی نظام کی بنیاد ہی اجتماعی ملکیت کے اصول پر ہے لہٰذا اشتراکی معاشی نظام کے ساتھ جمہوریت کے نفاذ کی باتیں کرنا حماقت سے زیادہ کچھ نہیں۔
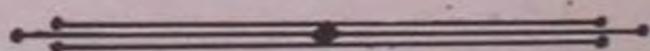
حضرت ابوذر غفاریؓ اور اسلامی سوشلزم

اسے ہماری بد قسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مملکتِ خداداد پاکستان میں بھی جس کی بنیاد ہی "پاکستان کا مطلب کیا "لا الہ الا اللہ" کے نعرہ پر رکھی گئی تھی، کمیونسٹوں کو کچھ ایسے افراد ہم ہی میں سے مل گئے ہیں جن کے ذریعے وہ کمیونزم کی ابتدائی شکل سوشلزم کا پرچار کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ گو یہاں بھی انہوں نے سوشلزم کو اپنے روایتی انداز میں ایک نیا لبادہ پہنا کر اسلامی سوشلزم کے نام سے پیش کیا ہے۔ اسلامی سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی بنیاد ہی محض دھوکا اور فریب پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس سے مراد وہ نظام ہے جو اپنے عام عرفی مفہوم میں ایک مستقل نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے اور زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ اس سے وہی نظام مراد ہے تو سوشلزم کے ساتھ اسلام کا نام لگا کر پاکستان کے سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ سوشلزم کے علمبرداروں کو یہ پورا یقین ہے کہ پاکستانی مسلمان اپنی اس گئی گزری حالت میں بھی اسلام کے علاوہ اور کسی بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے اور اگر اسلامی سوشلزم سے مراد اسلام کا سماجی انصاف ہے تو اسلامی سوشل جسٹس کہنے کے بجائے اسلامی سوشلزم کہنا ان حضرات کو فریب دینا ہے جو

سوشلزم کے نظریہ سے مرعوب ہیں۔ اور اسلام سے مایوس ہو کر سوشلزم میں اپنی نجات سمجھے ہوئے ہیں غرض اسلامی سوشلزم ہر لحاظ سے ایک دھوکہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے علمبردار اس کا مفہوم متعین کرنے میں ہر روز ایک نیا پینترا بدلتے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرف سوشلزم کی نسبت

کچھ روز سے سوشلسٹ حضرات نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہم اس سوشلزم پر ایمان رکھتے ہیں۔ جس کے قائل حضرت ابوذر غفاریؓ تھے۔ حالانکہ سوشلزم جیسے ملحدانہ نظریہ کی نسبت حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے اولوالعزم صحابی کی طرف کرنا نہ صرف یہ کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی توہین ہے بلکہ اسلام کو مسخ کرنے کی ایک مذموم کوشش ہے۔ جو لوگ حضرت ابوذر غفاریؓ پر یہ اتہام لگانے کی جسارت کر رہے ہیں وہ یا تو سوشلزم سے ناواقف ہیں یا ابوذر غفاریؓ کے مسلک سے نابلد گو اغلب گمان یہ ہے کہ یہ حضرات سب کچھ جانتے ہوئے بھی حضرت ابوذر غفاریؓ کے نام کو اپنے اغراض کا آلۂ کار بنانے کی مذموم کوشش میں مصروف ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کے مذہب و مسلک پر گفتگو کرنے سے پہلے اس حقیقت کی نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ جس طرح زندگی کے دیگر تمام گوشوں کے لحاظ سے کامل و اکمل تھی اسی طرح فقر، کفاف اور غنا کے تینوں ادوار کے لحاظ سے بھی جامع تھی اور جس طرح صحابۂ کرامؓ آپ کے اسوۂ حسنہ کا مکمل نمونہ ہوتے تھے اسی طرح مختلف صحابہؓ میں آپ کی سیرت کا کوئی ایک پہلو زیادہ نمایاں ہوتا تھا چنانچہ بعض صحابہؓ اگر غنا یا کفاف کا نمونہ تھے تو بعض کی زندگی میں فقر اور زہد کا رنگ غالب تھا۔ حضرت

ابوذر غفاریؓ بھی زہد اور فقر کی مجسم مثال تھے۔ آپ کے زہد کو سوشلزم کے مترادف قرار دینا سراسر زیادتی ہی نہیں بددیانتی ہے۔

سوشلزم کی جبری محرومی اور اسلام کے اختیاری زہد میں بنیادی فرق

سوشلزم کی جبری محرومی اور اسلام کے اختیاری زہد میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سوشلزم شخصی ملکیت کو سرے سے ہی کالعدم قرار دے کر افراد معاشرہ سے سب کچھ چھین لیتا ہے۔ اور حکومت وقت کو ہر فرد کے املاک و اموال کا جائز مالک قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس زہد کے معنی یہ ہیں کہ شخصی ملکیت اپنی جگہ پوری طرح برقرار رہے اور افراد معاشرہ اپنی جائز املاک میں پوری طرح تصرف کرتے ہوئے اپنے اختیار سے اپنے اموال جمع کرنے کے بجائے معاشرہ کے دوسرے ضرورت مند افراد پر تقسیم کر دیں۔ حکومت کو کوئی حق نہیں کہ کسی فرد واحد کی بھی جائز ملکیت میں کسی قسم کا ناجائز تصرف کر سکے۔ اسلام کی پیش کردہ زاہدانہ زندگی جس طرح ایک عام سرمایہ دار سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اپنی ضرورت سے زیادہ مال دوسرے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دے اسی طرح حکومت کے ارباب اختیار کو بھی یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے اموال جمع کر کے رکھتے رہیں اور ضرورت مندوں پر خرچ نہ کریں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک

حضرت ابوذر غفاریؓ زہد کے مسلک پر کاربند تھے۔ چنانچہ سوشلسٹوں کی طرح آپ شخصی ملکیت کے ہرگز مخالف نہ تھے۔ بلکہ آپ کا مطالبہ محض اتنا تھا کہ دولت مند اپنے اموال کو جمع کر کے نہ رکھیں۔ جو کچھ آئے، اُسے فوراً حاجت مندوں

پر خرچ کر دیں اور اسی پر آپ کا عمل بھی تھا۔ حضرت معاویہؓ امتحان کے طور پر آپؓ کو ایک رات اشرفیوں کی ایک تھیلی بھجواتے ہیں۔ آپ اسے قبول کر لیتے ہیں مگر صبح سے پہلے پہلے اسے تقسیم کر کے فارغ بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ شخصی ملکیت کے قائل نہ ہوتے تو وہ تھیلی قبول ہی نہ فرماتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ اپنی ملکیت کی تائید میں قرآن کریم کی جس آیت کو بار بار پیش فرماتے تھے وہ خود اس حقیقت پر دال ہے کہ آپ شخصی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے زہد کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ سورہ توبہ کی آیت "وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ" کی تلاوت کرتے اور فرماتے "اے مال دارو! فقیروں کی غم خواری کرو" اس آیت میں ولا ینفقونھا کے الفاظ اس بات کی بیّن دلیل ہیں کہ یہ آیت شخصی ملکیت کا ابطال نہیں کرتی جب تک کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہ ہو اس کے خرچ کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ آیت خود اس پر گواہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ شخصی و ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی اس سلسلے میں دیگر صحابہؓ سے جو گفتگو ہمیں سیر کی کتابوں میں ملتی ہے اس میں بھی یہ حقیقت واضح طور سے نظر آتی ہے کہ آپؓ شخصی ملکیت کے ہرگز مخالف نہ تھے۔ ایک موقع پر شام میں جب حضرت معاویہؓ کو آپؓ قلعۃ الخضراء کی طرف فخر کی نگاہ سے دیکھتا ہوا پاتے ہیں تو فرماتے ہیں "معاویہؓ! اگر یہ خدا کے مال سے ہے تو خیانت ہے

اور اگر تیرے مال سے ہے تو اسراف ہے۔" صاف ظاہر ہے کہ خدا کے مال سے حضرت ابوذر غفاریؓ کی مراد بیت المال ہے اور تیرے مال کے الفاظ سے آپؓ کا اشارہ حضرت معاویہؓ کے ذاتی مال کی طرف ہے۔ اگر آپ شخصی ملکیت کے قائل نہ ہوتے تو بیت المال کے مال اور حضرت معاویہؓ کے ذاتی مال کی تفریق نہ کرتے اور بے جا تصرف کو ایک میں خیانت اور ایک میں اسراف سے تعبیر نہ فرماتے بلکہ اسے محض خیانت کے نام سے تعبیر کرتے۔ اسی طرح ایک اور موقع پر شام ہی کی ایک مسجد میں امیروں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اے مال جمع کرنے والے تیرے مال میں تین شریک ہیں"

(۱) تقدیر، جو تیرے برے بھلے مال کے بارے میں تجھ سے مشورہ نہیں لیتی اور اسے ہلاک کر دیتی ہے۔

(۲) وارث، جو اس بات کا منتظر ہے کہ تیری آنکھ بند ہو اور وہ تیرے مال کو لے جائے۔

(۳) خود تو، لہٰذا اگر ہو سکے تو تینوں میں تو عاجز نہ بن۔

اب آپؓ کے اس ارشاد میں بھی مال کی نسبت اس کے مالک کی طرف جا رہی ہے اور وارث کا اپنے مورث کے مال کا منتظر رہنا یہ تبلا رہا ہے کہ ایک شخص مال کا مالک ہو گا تو وارث اس کے مرنے کے بعد اس کے مال کا منتظر ہو گا۔ اگر کوئی سرے سے مال کا مالک ہی نہ ہو تو وارث کس چیز کا منتظر ہو گا۔ مزید براں اس موقعہ پر تو حضرت ابوذر غفاریؓ کا ارشاد شخصی ملکیت کے بارے میں بڑا واضح ہے۔ آپؓ صاف طور سے فرما رہے ہیں، اپنے مال کا تو خود مالک

ہے، اور آپؓ کا یہ کہنا کہ "تینوں میں عاجز نہ بن" صاف اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آپ مخاطب کو اس کے مال میں تصرف کا پورا پورا حق دیتے ہوئے اس کو اس بات کی ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ عاجز نہ بنے اور اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے قبل اس کے کہ تقدیر یا وارث اس سے یہ مال چھین لے وہ خود اس کو حاجت مندوں پر خرچ کر دے۔ غور کا مقام ہے کہ کہاں اشتراکیت کا یہ دعویٰ کہ شخصی ملکیت فساد کی جڑ ہے، اور کہاں حضرت ابوذر غفاریؓ کا محولہ بالا ارشاد کہ اپنے مال کا تو خود مالک ہے، لہٰذا مرنے سے پہلے اسے حاجتمندوں پر خرچ کر جا۔ ہے کوئی نسبت حضرت ابوذر غفاریؓ کے اس مسلک زہد سے اشتراکیت کے اس غیر فطری نظریئے کو جو شخصی ملکیت ہی کو سرے سے فساد کی جڑ ٹھہراتا ہے؟

اسی طرح ایک موقعہ پر حضرت ابوذر غفاریؓ کو یہ علم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنے ہر خطبے میں اس بات کو خاص طور پہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "مال اللہ کا ہے" تو آپ غصّے میں بھرے ہوئے حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچتے ہیں اور فرماتے ہیں "معاویہؓ، تو مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کیوں کہتا ہے؟" پھر حضرت معاویہؓ کے استفسار پر آپؓ فرماتے ہیں "مالِ غنیمت مسلمانوں کا ہے تجھے اس کا ذخیرہ کرنے کا کیا حق ہے؟" غور فرمایئے حضرت ابوذرؓ حضرت معاویہؓ سے اس بات پر ناراض ہیں کہ آپؓ نے مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی بجائے بیت المال میں ذخیرہ کر کے کیوں رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ اشتراکی نقطۂ نظر سے تو آپ کو اس پر مسرت کا اظہار کرنا چاہیئے تھا کہ مال شخصی ملکیت کے فساد سے بچا ہوا بیت المال میں محفوظ ہے اور حکومت کے پورے تصرف میں ہے کہ

اجتماعی مفاد کے لیے جس طرح چاہے خرچ کرے حضرت ابوذرؓ کا اس موقعہ پر ناراضگی کا اظہار کرنا کیا اس بات کے ثبوت کے لیے کافی نہیں کہ آپؓ شخصی ملکیت ہی کو اجتماعی مفاد کی اصل روح خیال فرماتے تھے۔ "الارض للہ" کی غلط تاویل کرنے والے ذرا ابوذرؓ کے اس ارشاد پر غور فرمائیں کہ "مال غنیمت مسلمانوں کا ہے" اور یہ کہ معاویہؓ تو مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کیوں کہتا ہے؟ کیا حضرت ابوذرؓ کے اس ارشاد کا مقصد حضرت معاویہؓ کی توجہ اسی بات کی طرف مبذول کرانا نہیں ہے کہ آپ کا یہ کہنا کہ "مال اللہ کا ہے" کہیں سننے والے کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دے کہ اس سے مسلمانوں کی انفرادی ملکیت ساقط ہو گئی اور پھر حضرت معاویہؓ کا اس کے جواب میں یہ کہنا کہ "اچھا اب میں یہی کہا کروں گا کہ مال مسلمانوں کا ہے" کیا اس بات کا بین ثبوت نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بھی حضرت ابوذرؓ کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ اس طرح کے الفاظ سے غلط فہمی کا امکان ہے اور یہ کہ واقعی مال پر مسلمانوں کی ملکیت ثابت ہے۔

حضرت ابوذرؓ کے اس مسلک پر کہ آپؓ شخصی ملکیت کو پوری طرح جائز سمجھتے تھے، آپؓ کی زندگی کا ایک آخری عمل بھی شاہد ہے۔ حضرت عثمانؓ کی خواہش پر جب حضرت ابوذرؓ ربذہ میں مقیم ہوئے تو حضرت عثمانؓ نے آپ کو اونٹوں کا ایک ریوڑ اور دو غلام مرحمت فرمائے۔ آپ نے قبول فرمائے اور اپنی بقیہ عمر اسی پر بسر اوقات فرماتے رہے۔ اگر آپؓ شخصی ملکیت کے قائل نہ ہوتے تو آپ یہ عطیہ ہرگز قبول نہ فرماتے۔

حضرت ابوذر سرمایہ کے مخالف نہ تھے بلکہ سرمایہ پرستی کے مخالف تھے

مذکورہ بالا شواہد سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابوذرؓ شخصی ملکیت کو ممنوع خیال نہ فرماتے تھے بلکہ بخل کو مذموم سمجھتے تھے۔ آپ مال داروں کی مذمت اس حیثیت سے نہ فرماتے تھے کہ وہ مالدار ہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے فرماتے تھے کہ وہ مال جمع رکھتے ہیں بخل سے کام لیتے ہیں۔ اور خدا کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔ آپؓ کی نظر اگر ان آیاتِ قرآنی پر تھی جن میں مال جمع کرنے کی مذمت بیان ہوئی ہے، تو آپ ان آیات سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ جن میں مال کو اللہ تعالیٰ نے خیر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح آپ کی نظر سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث بھی مخفی نہ تھیں، جن میں آپ نے بعض صحابہؓ کے لیے مالِ کثیر کی دعا فرمائی تھی۔ حضرت انسؓ کے بارے میں ایک بار آپ نے دعا فرمائی۔

اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهٗ وَوَلَدَهٗ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ۔

"میرے اللہ اس کے مال اور اولاد میں زیادتی فرما اور اس کو جنت میں داخل کر۔"

اس کے علاوہ حضرت ابوذرؓ نے جس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ کے وہ دور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمائے جو فقر یا کفاف کا نمونہ تھے، اسی طرح آپؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا وہ دور بھی دیکھا جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر فتوحات کے دروازے کھولے گئے اور ان کے ذریعے سے آپ غنا کی حدود میں داخل ہو گئے، مگر آپ نے اپنی

اس حالت کا بھی پورا پورا حق ادا فرمایا اور اپنا تمام مال مستحق لوگوں پر صرف فرما دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اسی دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ قرطبی شرح بخاری میں کفاف کی فضیلت کے بیان میں لکھتے ہیں۔

"ثُمَّ فُتِحَتْ عَلَيْهِ الْفُتُوْحُ فَصَارَ بِذَالِكَ فِيْ حَدِّ الْاَغْنِيَاءِ فَقَامَ بِوَاجِبِ ذَالِكَ مِنْ بَذْلِهٖ لِمُسْتَحِقِّهٖ وَالْمُوَاسَاةِ بِهٖ وَالْاِيْثَارِ مَعَ اِقْتِصَادِهٖ مِنْهُ عَلٰى مَا يَسُدُّ ضَرُوْرَةَ عِيَالِهٖ"

(ترجمہ) پھر آپ پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے گئے اور آپ امرا کی حد میں داخل ہو گئے لیکن آپ نے اس کا حق بھی اس طرح ادا کیا کہ اس مال کو مستحقین پر خرچ فرماتے رہے ہمدردی و ایثار فرماتے رہے۔ نیز اپنے کنبہ کی ضرورت کے لیے بچا کر بھی رکھا۔"

پس آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود مال کا مالک بنتے اور اس میں تصرف فرماتے دیکھ کر بھی حضرت ابوذر غفاریؓ کیسے مال کو مذموم سمجھتے یا شخصی ملکیت کا ابطال فرماتے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کے علاوہ دیگر مقتدر صحابہ کی زندگیاں بھی حضرت ابوذرؓ کے سامنے تھیں۔ ان میں سیدنا حضرت عثمانؓ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ حضرت انسؓ بن مالک اور زبیر بن العوام، کی شخصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ خیال کرنا بھی درست نہیں کہ جمہور صحابہؓ زہد و فقر کے مسلک کے پیروکار تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر صحابہ نے غنا یا کفاف کی حالت کو اختیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں۔

"وَدَعْوَى اَنَّ جُمْهُوْرَ الصَّحَابَةِ كَانُوْا عَلَى التَّقَلُّلِ وَالزُّهْدِ مَمْنُوْعَةٌ بِالْمَشْهُوْرِ مِنْ اَحْوَالِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَانُوْا عَلٰى قِسْمَيْنِ بَعْدَ اَنْ فُتِحَتْ عَلَيْهِمُ الْفُتُوْحُ فَمِنْهُمْ مَنْ اَبْقٰى مَابِيَدِهٖ مَعَ التَّقَرُّبِ اِلٰى رَبِّهٖ بِالْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْمُوَاسَاةِ مَعَ الْاِتِّصَافِ بِغِنَى النَّفْسِ وَمِنْهُمْ مَنِ اسْتَمَرَّ عَلٰى مَاكَانَ عَلَيْهِ وَهُمْ قَلِيْلٌ بِالنِّسْبَةِ لِلطَّائِفَةِ الْاُخْرٰى"

(فتح الباری جلد نمبر ۱۱ ص ۲۱۷)

یہ دعویٰ کہ تمام صحابہؓ فقر کی حالت پر تھے۔ ان کے مشہور حالات کے پیش نظر قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ فتوحات کے بعد صحابہؓ دو قسم کے تھے، بعض وہ جنہوں نے اپنے مال کو اپنے پاس رکھا باوجود اس کے کہ وہ غناء النفس کے ساتھ متصف رہے۔ اور نیکی، صلہ رحمی اور غم خواری کے ذریعے سے خدا کا تقرب حاصل کیا اور بعض وہ تھے جو اپنی پہلی جیسی حالت (حالتِ فقر) پر رہے اور اس قسم کے صحابہؓ پہلی قسم کے صحابہؓ کی نسبت بہت کم تھے"

حضرت علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کی یہ عبارت اس بات پر دال ہے کہ اکثر صحابہؓ غنا یا کفاف کی حالت پر تھے۔ چنانچہ ان صحابہؓ سے حضرت ابوذرؓ کو یہ شکایت ہرگز نہ تھی کہ یہ مال کے مالک کیوں ہیں۔ بلکہ آپ کو ان حضرات سے اصل اختلاف یہ تھا کہ آپ آیت قرآنی۔۔ "والذین یکنزون الذھب ۔۔۔۔۔ الخ۔ میں مال جمع کرنے کی جو وعید آئی ہے۔ اس میں

شخص کو بھی داخل سمجھتے تھے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی کوئی مال اپنے پاس جمع کر چھوڑے۔ اس کے برخلاف جمہور صحابہؓ کی یہ رائے تھی کہ یہ وعید اسی شخص کے لیے ہے جو زکوٰۃ نہ دے۔ اگر زکوٰۃ دے کر جمع کرے تو پھر اس وعید میں داخل نہیں۔ اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "کنز" کے صحیح اطلاق کے بارے میں چند متقدر صحابہؓ و تابعینؒ کی آراء نقل کر دی جائیں۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کا یہ مسلک بھی کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی مال کا جمع کرنا داخل وعید ہے، اجماع سے مختلف تھا۔ چنانچہ احادیث و روایات ملاحظہ فرمائیے

(۱) صاحب مشکوٰۃ ابوداؤد کے حوالے سے کتاب الزکوٰۃ کی دوسری فصل میں درج ذیل حدیث روایت کرتے ہیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كَبُرَ ذَالِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ عُمَرُ اَنَا اُفَرِّجُ عَنْكُمْ فَانْطَلَقَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنَّهٗ كَبُرَ عَلٰى اَصْحَابِكَ هٰذِهِ الْآيَةُ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَفْرِضِ الزَّكٰوةَ اِلَّا لِيُطَيِّبَ مَا بَقِيَ مِنْ اَمْوَالِكُمْ وَاِنَّمَا فَرَضَ الْمَوَارِيْثَ وَذَكَرَ كَلِمَةً لِتَكُوْنَ لِمَنْ بَعْدَكُمْ فَقَالَ فَكَبَّرَ عُمَرُ ۔۔۔۔ الخ

"حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب آیت یکنزون الذھب۔ الخ اتری تو یہ آیت مسلمانوں کو بھاری معلوم ہوئی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اس مشکل کو حل کرتا ہوں۔ پس آپؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں گئے اور عرض کیا، اے اللہ کے نبیؐ! یہ آیت آپ کے صحابہ پر بھاری معلوم ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ اسی لیے تو فرض کی گئی ہے کہ تمہارے باقی اموال کو پاک کرے اور اسی لیے میراث بھی فرض کی گئی ہے اور ایک کلمہ ذکر فرمایا و تا کہ ہو میراث تمہارے بعد والوں کے لیے" حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں حضرت عمرؓ نے یہ سن کر (خوشی سے) تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔

صاحب مظاہر حق اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں۔

"پس آیت مذکورہ میں جو وعید آئی ہے۔ مال کے جمع کرنے پر تو وہ اسی صورت میں ہے کہ زکوٰۃ نہ دے اور اگر زکوٰۃ دے کر جمع کرے داخل وعید میں نہیں"

(۲) حضرت امام بخاریؒ کتاب الزکوٰۃ کے تحت حضرت ابن عمر کی ایک روایت لائے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں۔

مَنْ كَنَزَهَا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكٰوتَهَا فَوَيْلٌ لَهٗ اِنَّمَا كَانَ هٰذَا قَبْلَ اَنْ تُنْزَلَ الزَّكٰوةُ فَلَمَّا نَزَلَتْ جَعَلَهَا اللّٰهُ طُهْرًا لِلْاَمْوَالِ۔

جو شخص سونا چاندی جمع کرے اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو اس کے لیے خرابی ہے۔ جمع کی ممانعت زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھی۔ پس جب آیت زکوٰۃ اتری تو اللہ تعالیٰ نے اس کو باقی اموال کی پاکی کا ذریعہ بنا دیا"

(۳) امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں ایک مستقل باب "ما اُدِّیَ زکوٰتہٗ فلیسَ بِکَنْزٍ" کے نام سے باندھا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ امام بخاریؒ بھی اسی مسلک کے حامی تھے۔

(۴) علامہ عینیؒ شرح بخاری میں فرماتے ہیں۔

"فَمَعْلُوْمٌ اَنَّ الْکَنْزَ ھُوَ الْمَالُ وَاِنْ بَلَغَ اُلُوْفًا اِذَا اُدِّیَتْ زَکوٰتُہٗ فَلَیْسَ بِکَنْزٍ وَلَا یُحَرَّمُ عَلٰی صَاحِبِہٖ اِکْتِنَازُہٗ لِاَنَّہٗ لَمْ یَتَوَعَّدْ عَلَیْہِ وَاِنَّمَا الْوَعِیْدُ عَلٰی مَا لَمْ تُؤَدِّ زَکوٰتُہٗ"

"یہ معلوم ہے کہ کنز وہ مال ہے، چاہے وہ ہزاروں تک پہنچ جائے کہ جب اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو وہ کنز نہیں اور نہ اس کے مالک پر اس کا اکتناز حرام ہے کیونکہ اس پر وعید نہیں۔ وعید صرف اس کنز پر ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے"

اختصار مدِ نظر ہے ورنہ اس سلسلے میں بہت سے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں اس بارے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں کہ حضرت ابوذرؓ کا کنز کی حقیقت کے بارے میں مذکورہ مسلک اجماع کے خلاف تھا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے نظریات کی تائید میں حضرت ابوذرؓ کے مسلکِ زہد کو پیش کرنے والے اجماع اُمت کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ بات واضح ہے کہ جتنی آسانی سے حضرت ابوذر غفاریؓ کے مسلک کو غلط تاویلات کے ذریعہ اپنی اغراض کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے اجماع اُمت کے مسلک میں وہ آسانی حاصل نہیں۔ دراصل

۔ان حضرات کو نہ تو حضرت ابو ذر غفاریؓ کے مسلک سے کوئی دلچسپی ہے، نہ اجماع اُمت کے موقف سے کوئی تعلق۔ ان کو ہر ڈھنگ سے سادہ لوح ناواقف مسلمانوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسانا ہے۔ اگر ان کو حضرت ابو ذر غفاریؓ کے مسلک سے ذرا بھی تعلق ہوتا تو پھر انتظار کس بات کا تھا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا شواہد سے یہ ثابت ہو چکا ہے، حضرت ابو ذر غفاریؓ نے یہ مطالبہ تو کبھی نہیں کیا کہ حکومتِ وقت شخصی ملکیت کو ساقط قرار دے کر تمام وسائل دولت پر قبضہ کر لے اور پھر ہر ایک پر مساویانہ تقسیم کرے۔ آپ تو بلا واسطہ سرمایہ داروں سے خواہ وہ اربابِ اقتدار سے تعلق رکھتے ہوں، یا عوام میں سے ہوں، یہ مطالبہ کرتے تھے کہ تم اموال میں سے اپنے اختیار سے حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرو اور اسی پر حضرت ابو ذر غفاریؓ کا عمل بھی تھا۔ آپ کے پاس جو کچھ آتا وہ آپ راہ خدا میں خرچ کر دیتے۔ وہ حضرات جو حضرت ابو ذر غفاریؓ کے مسلک کا حوالہ دیتے نہیں تھکتے۔ اگر اپنے دعاوی میں سچے ہیں تو دیر کس بات کی ہے؟ عمل میں تاخیر کے کیا معنی ہیں؟ جو کچھ حضرت ابو ذر غفاریؓ کا مطالبہ تھا اس سے پہلو تہی کیسی؟ حضرت ابو ذر غفاریؓ کی زاہدانہ زندگی کی تقلید سے گریز کیوں؟ یہ محلات، یہ کاریں، یہ بنک بیلنس، یہ زائد از ضرورت زندگی کی آرائش وزیبائش کے لوازم، یہ سب کیا ہے؟۔ ذرا اپنے ضمیر سے پوچھیے۔ ان سب آسائشوں اور راحتوں کو سینے سے لگائے رکھنے کے باوجود آپ کا حضرت ابو ذر غفاریؓ کے مسلک کی علمبرداری کا دعویٰ کس حد تک درست ہے؟۔

اسلامی سوشلزم

اپنے مفہوم کی روشنی میں

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح ایک ایسا گورکھ دھندا ہے کہ جتنا سلجھاؤ اتنا ہی اُلجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریئے کے علمبردار خود بھی اس کا کوئی مفہوم آج تک متعین نہیں کر سکے۔ وہ اُسے کبھی اسلام کے سماجی انصاف کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ تو کبھی اسلامی مساوات کے ہم معنی ٹھہراتے ہیں۔ اور کبھی معیشت کو مذہب سے جدا کر کے اس نظریئے کو اسلام اور سوشلزم کا ایک ملغوبہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اشتراکی حضرات کی اس سلسلے میں پیش کردہ کوئی ایک توجیہہ بھی اس قابل نہیں کہ دلائل کا مقابلہ کر سکے۔ دلائل کا مقابلہ تو دور کی بات ہے ان کی پیش کردہ توجیہات میں تو اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ ایک عام آدمی کے ذہن میں جو سوالات اس سلسلے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا تشفی بخش جواب ہی دے سکیں۔ دراصل ریت کی بنیاد پر کبھی کوئی دیوار تعمیر نہیں ہوا کرتی۔ جس نظریئے کی بنیاد ہی دھوکہ اور فریب پر رکھی گئی ہو اس میں کسی

درجہ بھی معقولیت کے نشانات تلاش کرنا محض ایک فعل عبث ہے۔ ایسا نظریہ اپنے مخاطبین پر اثر کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم نہیں ہوتا۔ اپنے علمبرداروں کو بھی اخلاقی جرأت کے فقدان کے علاوہ کچھ نہیں بخش سکتا۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ کہ یہ وہی معروف نظریہ ہے جسے دنیا کمیونزم کی ابتدائی شکل کی حیثیت سے پہچانتی ہے۔ پاکستان کے اشتراکی حضرات نے اسے اسلام کے نام سے صرف اس لیے متعارف کیا ہے، تاکہ وہ پاکستانی مسلمانوں کو اپنے دام تزویر میں آسانی سے پھانس سکیں۔ کیونکہ اتنا تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پاکستان کا مسلمان ہر قسم کا نقصان برداشت کر سکتا ہے۔ مگر اسلام کے نام پر تو کوئی حرف آتا دیکھ کر اس کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اسلام کے بارے میں پاکستانی مسلمان کے جذبات بہت نازک ہیں۔ اس لیے اگر اگر اس کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے تو اسلام ہی کے نام پر اور یہ اشتراکی حضرات کی پرانی تکنیک ہے جو وہ ہر ملک میں جہاں جہاں وہ پہنچے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ سوشلزم اپنی پوری تاریخ میں جہاں کہیں بھی پہنچا وہاں کے مقبول قومی نعرے کو اس نے اپنے نام کے ساتھ ضرور استعمال کیا۔ مگر پاکستان میں اپنی یہ پرانی تکنیک استعمال کرتے ہوئے شاید اشتراکی حضرات یہ بھول گئے کہ اسلام کا لفظ محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس لیے صرف اسلام کا لیبل لگا لینے سے سوشلزم مشرف بہ اسلام نہ ہو سکے گا۔ یہاں تو قدم قدم پر ٹھوس دلائل کا سامنا کرنا ہو گا۔ یہاں جذباتیت اور سطحی نعروں سے کام نہ چلے گا۔ یہاں تو ایسی معقولیت درکار ہے۔ جس کی پشت پر مضبوط دلائل ہوں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہی ایک

جنس ایسی ہے جو سوشلزم کے بازار میں نایاب ہے۔ سوشلزم اب تک جس ملک میں آیا مقبولیت یا دوسرے لفظوں میں جمہوریت کی راہ سے نہیں آیا۔ اس نے ہمیشہ اور ہر جگہ چور دروازہ ہی تلاش کیا۔ دھن، دھونس اور دھاندلی ہی اس کا طرہ امتیاز رہا۔

قطع نظر اس سے کہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کا استعمال کس حد تک صحیح ہے اور اس اصطلاح کا کوئی معقول مفہوم ہے بھی یا نہیں، ہمیں انصاف سے یہ سمجھنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ کہ اشتراکی حضرات اس اصطلاح کے جو مختلف مفہومات بیان کرتے رہتے ہیں۔ وہ دلائل کی روشنی میں کہاں تک معقول ہیں؟ اس سلسلے میں ان کے دعاوی دلائل کی کسوٹی پر پورے بھی اترتے ہیں۔ یا یہ سب کچھ محض ملمع کاری ہے؟ اسلامی سوشلزم کے جو مختلف مفہوم مختلف مواقع پر اشتراکی حضرات کی طرف سے پیش کیئے جاتے ہیں، وہ عموماً ان ہی تین بڑے مفہومات کے گرد گھومتے ہیں۔ جو ابتدا میں ذکر ہوئے۔ یعنی اوّل یہ کہ اسلامی سوشلزم سے مراد اسلام کا سماجی انصاف ہے، دوم یہ کہ یہ اسلامی مساوات کے ہم معنی ہے۔ اور جب کسی طرح ان دونوں دعاوی کی مقبولیت ثابت نہیں ہوتی تو تیسرے درجے پر بے چارے اشتراکی تھک ہار کر کہتے ہیں اسلامی سوشلزم کا مقصد اسلام کو بطور مذہب برقرار رکھتے ہوئے سوشلزم کے محض معاشی نظام کو بروئے کار لانا ہے۔ زیر نظر تحریر میں ہمیں انہی تین مفہومات کا جائزہ لینا ہے تاکہ حقیقت حال واضح ہو اور اسلامی سوشلزم کا صحیح مفہوم متعین ہو سکے۔

کیا اسلامی سوشلزم کا مفہوم اسلام کا اجتماعی عدل ہے

اسلامی سوشلزم کا مفہوم اگر اسلام کا سماجی یا اجتماعی انصاف ہے تو سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک طرف تو اشتراکی حضرات اسلامی سوشلزم کا یہ مفہوم بتاتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ تمام وسائل دولت کو قومی ملکیت میں لینے اور شخصی ملکیت کو فساد کی جڑ قرار دینے کی باتیں کرتے ہیں۔

گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ شخصی ملکیت کے ابطال کا اصول سوشلزم اور اسلام میں مشترک ہے۔ اس لیے اسلامی سوشلزم کا مفہوم اسلام کا اجتماعی عدل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دعویٰ کا ثبوت ہمیں قرآن و سُنت سے پیش کرنا پڑے گا۔ کیونکہ کوئی بھی نظریہ اس وقت تک اسلامی نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کا ماخذ قرآن و سُنت نہ ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اور سوشلزم کے درمیان جو دیگر تضادات ہیں، ان سے قطع نظر محض شخصی ملکیت ہی کے تصور میں یہ دونوں نظام ہائے معیشت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سوشلزم کے نظریۂ معیشت سے اگر شخصی ملکیت کی نفی کا تصور نکال دیا جائے۔ تو ایک مستقل نظریہ کی حیثیت سے سوشلزم کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس کے بالمقابل اسلام میں شخصی ملکیت کے اثبات کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اسلام میں شخصی ملکیت

اسلام میں شخصی ملکیت کا تصور اس قدر بنیادی حیثیت کا حامل ہے کہ معاملات سے متعلق تمام تر اسلامی احکام کا دارومدار اسی پر ہے۔ محض معاملات ہی نہیں اخلاق و عبادات کے مکمل ڈھانچہ کا انحصار بھی کسی نہ کسی صورت میں اسی تصور پر

مبنی ہے۔ جس طرح بیع، شراء، ہبہ و اجارہ، شفعہ اور وراثت و تملیک وغیرہ کے اسلامی قوانین بلا واسطہ طور پر شخصی ملکیت کے ساتھ مربوط ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ صدقۂ فطر نفل صدقات و خیرات وغیرہ کے احکام بھی شخصی ملکیت کے جواز و عدم جواز سے بلا واسطہ منسلک ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ پہلے ہی مرحلہ پر ہو جانا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اسلام نے شخصی ملکیت کا جو تصور دیا ہے وہ اس تصور سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جو سرمایہ دارانہ نظام پیش کرتا ہے۔ سرمایہ داری کی نظر میں انسان کو اپنے مال پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے۔ وہ اس کو جس طرح چاہے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔ مگر اسلام کہتا ہے۔ کہ دولت اصلاً اللہ کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے پھر اللہ تعالیٰ جس کو عطا کر دے۔ وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کرتا ہے۔ مگر اپنی مرضی اور اپنے مصالح کا پابند بنا کر۔ گویا انسان کو دولت پر ملکیت تو حاصل ہے۔ مگر آزاد اور خود مختار نہیں۔ بلکہ اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود انسان کی اس ملکیت پر عائد ہیں۔ شخصی ملکیت کے سلسلہ میں یہی وہ بنیادی فرق ہے۔ جو اسلام اور سرمایہ داری کے لیے دو جدا جدا راہیں متعین کرتا ہے۔ اور اس بنیادی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے نتیجے میں بعض کوتاہ بین حضرات نے شخصی ملکیت کے تصور ہی کو بالکلیہ عیب جانتے ہوئے اسلام کے دامن کو اس سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے اور اسلام کے پیش کردہ نظریہ ملکیت کو تاویلات فاسدہ کے سہارے کچھ نہ کچھ بنا دیا ہے۔

اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کہ اسلام نے انسان کیلئے

جو ضابطۂ حیات متعین کیا ہے۔ اس میں انسان کی انفرادی وشخصی ملکیت کو اس حد تک نمایاں جگہ دی ہے۔ کہ اکثر انسانی اعمال کا مدار اسی کو ٹھہرایا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو جا بجا بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات بصراحت افراد کے لیے ملکیت کا حق تسلیم کرتی ہیں۔ اور واضح الفاظ میں افراد کو اپنی ملکیت پر پورا پورا تصرف کرنے کا حق عطا کرتی ہیں۔ اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات کے ذریعے شخصی ملکیت کے تصور کو پوری طرح واضح فرمادیا ہے۔ اس ضمن میں قران وسنت سے شواہد پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ حق ملکیت کی صحیح تعریف متعین کرلی جائے۔ مشہور مغربی محقق جان آسٹن نے ملکیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے یہ کسی متعین شئے پر ایک حق کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدود اور تصرف وانتقال کے اعتبار سے بے قید ہے"

اس کے مقابلے میں شریعت اسلامی کی نظر میں حق ملکیت کی جو تعریف ہے وہ مشہور حنفی محقق علامہ ابن نجیم کے الفاظ میں یوں ہے۔

اَلْمِلْكُ قُدْرَةٌ يُثْبِتُهَا الشَّارِعُ ابْتِدَاءً عَلَى التَّصَرُّفِ إِلَّا لِمَانِعٍ۔

"ملکیت تصرف کرسکنے کا اختیار ہے جس کا منبع شارع کا اذن ہے الّا یہ کوئی مانع ہو"

ابن ہمام نے بھی فتح القدیر میں اسی سے ملتی جلتی تعریف بیان کی ہے۔

ان دونوں تعریفوں کے درمیان اس فرق کے علاوہ کہ آسٹن کی تعریف ملکیت تصرف وانتقال کے حق کو بے قید اور غیر محدود ٹھہراتی ہے۔ اور اسلام میں اس حق کا انحصار مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ کے اذن پر موقوف ہے۔ یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ کسی چیز پر کسی کی ملکیت اسی وقت ثابت ہوتی ہے کہ جب اسے اس چیز میں تصرف وانتقال کا اختیار حاصل ہو۔ ملکیت کی تعریف کے اس تعین کے بعد دیکھئے کہ قرآن وسنت سے یہ حق افراد کے لیے ثابت ہوتا ہے۔ یا نہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وقف :۔ (النساء ۲۹)

"ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ۔ مگر یہ کہ تمہارے درمیان تجارت ہو آپس کی رضامندی سے"

اس آیتِ شریفہ میں جہاں اموالکم کے الفاظ شخصی ملکیت کا اثبات واضح الفاظ میں کر رہے ہیں۔ وہاں آپس کی رضامندی سے تجارت کا اختیار دے کر ان اموال میں افراد کے لیے تصرف کا حق بھی اس آیت نے ثابت کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پر قرض کے معاملے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے۔

إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ط

(البقرۃ ۲۸۲)

"جب آپس میں کسی مقررہ مدت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اس کی دستاویز لکھ لو"

ظاہر ہے کہ قرض کا معاملہ افراد آپس میں اسی صورت میں کر سکتے ہیں۔ جب انہیں اپنے اموال پر تصرف کا حق حاصل ہوگا۔ یہاں دین کا باب تفاعل سے لانا اس بات کا ثبوت بھی فراہم کر رہا ہے۔ کہ یہ معاملہ افراد کے درمیان ہوگا۔ حکومت اور عوام کے درمیان نہیں۔ چند آیات کے بعد اسی مقام پر اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ

(البقرۃ ۲۸۳)

(ترجمہ) "اگر تم سفر میں ہو اور (قرض کی دستاویز لکھنے کے لیے) کاتب نہ ہو تو رہن بالقبض رکھو۔"

یہ انداز بیان اور سفر کے دوران قرض دینے دلانے کا ذکر بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے کہ یہ معاملہ افراد کے درمیان ہے۔ اور اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک قرض دینے والے کو اپنے مال میں تصرف کا حق حاصل نہ ہو۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں قرآن کریم سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایک مقام پر محرمات کا ذکر کرنے کے بعد قرآن حکیم کہتا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔

(النساء ۲۴)

"اور ان (حرام عورتوں) کے سوا (باقی عورتوں کے معاملے میں) یہ بات تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہے کہ تم انہیں اموال کے بدلے حاصل کرو، نکاح کرنے والے بن کر نہ کہ ناجائز تعلقات رکھنے والے بن کر۔"

اسی طرح ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ط (النساء: ۴)

"اور عورتوں کو ان کے مہر نہایت خوشدلی سے ادا کرو"

ایک اور مقام پر ہے۔

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ط

(النساء۔۲۰)

"اگر تم نے کسی عورت کو (نکاح کے وقت) ڈھیر سامال بھی دیا ہو تو (طلاق دیتے وقت) اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو"

غرض یہ تمام امور یعنی اموال کے بدلے نکاح کا عمل میں آنا، عورت کو مہر کی ادائیگی یا ڈھیر سامان بطور بخشش عطا کر دینا، یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان کو اموال میں تصرف کا حق حاصل ہو۔ اسی حق کی مزید وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں ایسے صریح الفاظ میں فرمائی ہے کہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

ارشاد ہے :۔

كُلُّ ذِيْ مَالٍ اَحَقُّ بِمَالِهٖ يَصْنَعُ بِهٖ مَا شَآءَ۔

(کنز العمال جلد ۳ ص ۲۲۴ روایت ۳۴۸۳)

"ہر صاحب مال اپنے مال کا زیادہ حق دار ہے۔ وہ اس کے ساتھ جو چاہے کرے"

ذرا غور فرمایئے افراد کو اپنے اموال میں تصرف کا حق دینے میں کیسے

بہ ماشائم ،، کے الفاظ کس قدر صریح ہیں ۔

ان تمام آیات واحادیث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے ۔ کہ قرآن وسنت کی نظر میں افراد کو اپنے اموال میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس طرح ملکیت کی اس تعریف کی رو سے جو ہم اوپر متعین کر آئے ہیں ۔ افراد کیلئے پچاس فیصد حقِ ملکیت قرآن وسنت سے ثابت ہو گیا ۔ اب رہا انتقال ملکیت کے اختیار کا ثبوت افراد کے حق میں ، تو اس کے روشن شواہد سے تو قرآن وحدیث کے صفحات بھرے ہوئے ہیں ۔ بیع وشرار کے جتنے قوانین ہیں ، اجارہ وتملیک کے جتنے احکام ہیں اور ہبہ ووقف وغیرہ کے جتنے مسائل ہیں ، وہ سب افراد کے حق میں انتقال ملکیت کے اختیار کا ثبوت ہی تو فراہم کرتے ہیں ۔ علاوہ ازیں وہ آیات واحادیث جن میں مالک کی رضا مندی کے بغیر اس کی چیز پر کسی شخص کے قبضہ کر لینے یا اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کو باطل ٹھہرایا گیا ہے ، وہ بھی فی الحقیقت بالواسطہ طور پر افراد کے لیے انتقال ملکیت کا حق ہی ثابت کرتی ہیں ۔

مثلاً قرآن حکیم میں ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ
بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ

(النساء ۲۹)

" اے ایمان والو ! ایک دوسرے کے مال آپس میں ناحق طور پر مت کھاؤ ۔ لیکن (جائز طور پر) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو ۔"

یہ آیت باہمی رضامندی کے بغیر مال کھانے کو حرام ٹھہرا رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے تو اپنے مال کی ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔ مگر اس کی رضامندی کے بغیر کوئی دوسرا شخص اس کی ملکیت میں کسی قسم کے تصرف کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اسی بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان فرمایا۔

"كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ"

"ایک مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے قابلِ احترام ہے۔ (اور اس پر دست درازی ممنوع ہے) اس کا خون، اس کا مال، اس کی آبرو"

شریعتِ اسلامیہ نے تو اس انتقال ملکیت کے حق کا اس درجہ تحفظ کیا ہے کہ ایسے وقت میں بھی اس حق کو باقی رکھا۔ جب کوئی شخص دشمن کے ہاتھ میں قید ہو۔ اور بے بس ہو۔

أَجَزَ وَصِيَّةَ الْأَسِيرِ وَعِتَاقَهُ وَمَا صَنَعَ فِي مَالِهِ مَا لَمْ يَتَغَيَّرْ عَنْ دِينِهِ فَإِنَّمَا هُوَ مَالُهُ يَصْنَعُ فِيهِ مَا شَاءَ

(بخاری شریف جلد ۲ صد ۱)

"جو شخص دشمن کے ہاتھ میں قید ہو۔ اس کی وصیت عتاق اور اپنے مال میں تصرف کو جائز قرار دو جب تک وہ دین سے نہ پھرے کیونکہ مال اس کا اپنا ہے، وہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔"

غرض تصرف کے حق کی طرح انتقالِ ملکیت کا حق بھی دلائل قطعیہ و براہین شرعیہ

سے ثابت ہے۔ اور افراد کے حق میں ملکیت اموال کے ثبوت کے لیے انہی دو باتوں کا ثبوت درکار تھا۔ افراد اگر اپنے اموال میں قرآن و سنت کی رو سے تصرف کا حق بھی رکھتے ہیں اور انتقال ملکیت کا اختیار بھی انہیں حاصل ہے۔ تو بالکلیہ ملکیتِ اموال کے اثبات میں کیا اشکال باقی رہ گیا۔ اس کے علاوہ قرآن و سنت میں ایسے شواہد بھی بے شمار ہیں۔ جن میں مختلف قسم کے اموال کی بلا واسطہ نسبت افراد کی طرف کی گئی ہے۔ اور جو اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ کہ افراد کو املاک رکھنے اور ان پر تصرف کرنے کے تمام حقوق حاصل ہیں۔ مثال کے طور پر چند آیات و احادیث ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد ربانی ہے۔

(۱) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ۔ (یٰسٓ : ۷۱)

"کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لیے جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا پھر یہی لوگ ان کے مالک ہیں۔"

(۲) وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ط (النور: ۳۳)

"اور ان کو اللہ کے مال میں سے کچھ دو۔ جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔"

ان دونوں آیتوں میں جہاں یہ صراحت کر دی گئی ہے۔ کہ تمام چیزوں کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہاں انسان کی شخصی ملکیت کو بھی واضح طور پر قائم کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے متعدد مقامات پر زمین، باغ، گھر، زمین کی پیداوار

نقد سرمایہ اور دیگر اشیاء کی ملکیت افراد کی طرف منسوب کر کے یہ بتلا دیا کہ افراد کو ہر قسم کے اموال اپنی ملکیت میں رکھنے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً زمین کے بارے میں ارشاد ہے :۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا۔

"اس نے تم کو ان کی زمین ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا۔ جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا"

اس طرح باغ کی نسبت کرتے ہوئے فرمایا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ط

(الکہف ۳۲)

"ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی"

گھر کے متعلق ارشاد ہوا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ط (النور : ۲۷)

"اے ایمان والو اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو، تاوقتیکہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو"

زمینی پیداوار کی ملکیت کو یوں واضح کیا۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ

(البقرۃ: ۲۶۷)

"اپنی پاکیزہ کمائی میں اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو۔"

نقد سرمایہ کی ملکیت کو بھی اسی طرح صراحت سے بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ (البقرۃ ۲۷۹)

"اور اگر تم (سود خوری) سے توبہ کر لو تو تم اپنے اصل سرمایہ کے حقدار ہو۔"

ان تمام آیات میں مختلف قسم کے اموال کی ملکیت افراد کی طرف منسوب کر کے دراصل یہی بتلایا گیا ہے۔ کہ افراد کو ہر قسم کے اموال میں ملکیت کا حق حاصل ہے۔ ان آیات قرآنی کے ساتھ ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد ہے۔

اَلَا لَا تَظْلِمُوْا اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِنْہُ۔ (مشکوٰۃ شریف باب الغصب)

"خبردار ظلم نہ کرو خبردار! کسی شخص کا مال حلال نہیں مگر مال والے کی خوشی کے ساتھ۔"

ایک اور موقع پر فرمایا۔
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ"۔

(بخاری ابواب الظلم والقصاص)

(ترجمہ) " جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے "

یہ احادیث بھی شخصی ملکیت کے اثبات میں بڑی واضح ہیں۔ اختصار پیشِ نظر ہے ورنہ قرآن و سنت سے اس سلسلہ میں لاتعداد شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔ پھر ذرا اس پر بھی غور فرمایئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صحابہ انفرادی طور پر ہر قسم کی املاک اپنے پاس رکھتے تھے اور شریعت حقہ کی حدود میں رہتے ہوئے ان پر تمام تصرفات عمل میں لاتے تھے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر طرح کی املاک رکھتے اور ان کو اپنی ذاتی استعمال میں لاتے تھے۔ آپ کے زمانے میں یہ رواج عام تھا۔ کہ کوئی شخص اپنا نقد سرمایہ محفوظ رکھتا تو کوئی اپنی مرضی سے اسے کسی کاروبار میں لگا دیتا۔ قرض دینے یا نفع میں شرکت کے اصول پر کاروبار کرنے کی رسم بھی عام تھی۔ ذاتی استعمال کے لیے لوگ جانور بھی پالتے تھے۔ رہائش کے لیے مکان بھی اپنی ملکیت میں رکھتے تھے۔ زمینوں باغوں اور کھیتوں کے مالک بھی موجود تھے۔ ان تمام املاک کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ یہ تمام امور اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں انفرادی ملکیت کا رواج عام تھا۔ اس پر آپ نے کبھی نکیر نہیں فرمائی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک بھی ایسا فرمان نہیں ملتا۔

جو صراحتاً انفرادی ملکیّت کی نفی کرتا ہو۔ اس کے مقابلے میں ایسے ارشادات بے شمار ہیں۔ جو انفرادی ملکیّت کو سندِ جواز عطا کرتے ہیں۔ اگر بالفرض والمحال قرآن و سنت میں انفرادی ملکیّت کے جواز و تسلیم کا مثبت اعلان نہ بھی ملتا۔ تو شریعت کے عام اصول کے مطابق یہی خیال کیا جاتا کہ اسلام انفرادی ملکیّت کے اس رواج پر خاموشی اختیار کر کے اُسے سندِ جواز عطا کر رہا ہے۔ لیکن یہاں تو امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن پوری صراحت کے ساتھ انفرادی ملکیّت کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس حق کی تائید کرتے ہیں۔

قرآن و سنت کی ان تمام شہادتوں کی موجودگی میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی طرف انفرادی ملکیّت کے ابطال کی نسبت کی جائے۔ مگر حیرت ہوتی ہے۔ ان لوگوں پر جو اپنا سارا زور اس پر صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر یہ ثابت کر لیا جائے کہ اسلام نے انفرادی اور شخصی ملکیّت کا کوئی تصور دیا ہی نہیں۔ دراصل یہ لوگ اشتراکیت سے مرعوب ہیں اور اسی مرعوبیت کے نتیجہ میں وہ اشتراکی نظریات کو قرآنی آیات و احادیث نبویہ میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواہ اس کوشش میں انہیں آیات و احادیث میں تاویلاتِ فاسدہ ہی سے کام کیوں نہ لینا پڑے اس سلسلے میں سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ یہ لوگ نظریۂ ملکیّت کی بنا تو رکھتے ہیں ملکیّت کے اس تصور پر جو سرمایہ داری نے پیش کیا ہے۔ اور پھر کتاب و سنت کی رو سے اس کا باطل ہونا ثابت کر کے انکار اس تصور ملکیّت کا بھی

کر بیٹھتے ہیں - جو اسلام پیش کرتا ہے - غیر محدود اختیارات کا حامل وہ نظریۂ ملکیّت تو یقیناً اسلام کے نزدیک بھی باطل ہے - جو سرمایہ دارانہ نظام کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے برے نتائج نے معیشت انسانی کو فساد کا شکار بنا رکھا ہے - مگر ملکیّت کا وہ تصور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ چند حدود و قیود کا پابند ہے - اسلام نے اس کی واضح صورت ہی متعین نہیں کی اسکی عملی شکلیں بھی متعین کر دی ہیں اور وہی نظریۂ ملکیّت دراصل اس قابل ہے کہ انسانی معیشت کی اصلاح کا ضامن بن سکے -

جیسا کہ میں ابتدا میں ذکر کر آیا ہوں - اس کائنات کی ہر چیز کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے - مگر وہ اپنی طرف سے انسانوں میں سے جس کو جس چیز کا مالک بنا دے اس کو بھی ملکیّت کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں - گو یہ حقوق اللہ کی اذن کے پابند ہوتے ہیں - اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی معنی میں ملکیّت کی نسبت کو جو قرآن و حدیث میں جابجا بیان ہوئی ہے، اشتراکی حضرات نے اپنی اغراض کے حصول کے لیے سب سے بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے - ایک عام آدمی کو دھوکہ میں مبتلا کرنے کے لیے ان کا طرز استدلال، کچھ اس طرح ہوتا ہے، کہ اسلام میں ملکیّت کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے، اب کسی چیز میں خدا خود ظاہر ہو کر تو تصرف نہیں کرتا - اس کے تصرف کی یہی شکل ہے کہ اس کی جانب سے حکومتِ اسلامیہ یا خلافتِ شرعیہ اس کی مالک بنے - حالانکہ ان کی یہی دلیل خود ان کے خلاف جاتی ہے - اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر جس دلیل

ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشیاء میں تصرّف کا حق حکومت کے چند عہدے داروں کو عطا کرتے ہیں، اسی دلیل سے افراد معاشرہ کی طرف وہ حق کیوں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ تو کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے پھر یہ اشیائے صرف اور غیر صرف کی تفریق کیسی ہ کیا اشیائے صرف کی ملکیّت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت نہیں ہ مزید برآں اس پر بھی ذرا غور کیجیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کائنات کی دیگر تمام اشیاء کا مالکِ حقیقی ہے۔ اسی طرح انسان بھی خواہ مرد ہو یا عورت، اس کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ پس اگر خدا کی طرف سے ملکیّت کی نسبت کی بنیاد پر کائنات کی دیگر اشیاء کی انفرادی ملکیت کی نفی پر استدلال درست ہے تو آوارہ منش لوگ اگر یہی طرز استدلال عورت کی ملکیّت کے لیے استعمال کرنے لگیں۔ اور عورت کو بھی تمام قوم کی ملکیّت ماننے پر اصرار کرنے لگیں۔ تو آپ کے پاس ان کے اس اخلاقی فساد کا کیا جواب ہو گا سمجھ نہیں آتا کہ اشتراکی حضرات کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ مالکیّت ہی کیوں نظر آئی ہے۔ دوسری تمام صفتیں علم، سمع، بصر، ارادہ اور کلام وغیرہ بھی تو فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہیں اور ان کی نسبت بھی قرآن و حدیث میں جا بجا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کی گئی ہے۔ پھر اس بات کی کیا توجیہہ ان کے پاس ہے کہ وہ انسان کو بولنے والا، سننے والا، دیکھنے والا، ارادہ کرنے والا، تو کہہ سکتے ہیں۔ مگر مالک نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح یہ بات بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کہ ان اشتراکی حضرات کو قرآن پاک میں ان الارض اللہ کے الفاظ تو نظر آتے ہیں جن کی غلط تاویلات

میں یہ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مگر ان کی نظر قرآن پاک ہی کی آیت إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ پر نہیں پڑتی۔ یہ کیا دو رنگی ہے۔ کہ معیشت کے میدان میں تو قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا دعویٰ ہے۔ مگر حکومت وسیاست کے معاملے میں قرآنی دستور کی کوئی پرواہ نہیں۔ اِن الحکم الا للّٰہ میں تو حصر اور تاکید بھی اِن الارض للّٰہ کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ذرا خدائی قانون بھی تو نافذ کر کے دکھائیے۔ مالکیت کی طرح حاکمیت بھی تو صرف اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ معیشت کا ذکر ہو۔ تو آپ کو قرآنی آیات میں دور از کار تاویلات سے بھی گریز نہیں اور خدائی قانون کے نفاذ کی بات آئے تو آپ بغلیں جھانکتے نظر آئیں۔ حیرت ہوتی ہے جو لوگ اِن الارض للّٰہ کے الفاظ سے یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ ملکیت تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ اس آیت کے فوراً بعد آنے والے الفاظ کیوں حذف کر جاتے ہیں۔ ان الفاظ کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بھی تو فرما رہا ہے۔ کہ یورثہا من یشآء من عباده اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔ اس کا وارث بنا دیتا ہے۔

کیا اس آیت سے انفرادی ملکیت کا تصور سامنے نہیں آتا۔ جو ہم ابتدا میں ثابت کر آئے ہیں۔ کہ مالک حقیقی تو ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مگر اپنے بندوں کو اس نے ملکیت کے حقوق چند حدود و قیود کے ساتھ عطا کر دیئے ہوئے ہیں۔ اور ملکیت کا فی الحقیقت یہی وہ تصور ہے جو انسانی معیشت کے مزاج کو درست رکھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت

دونوں ہی افراط وتفریط پر ہیں۔ نہ شخصی ملکیت کو سرمایہ داری کی طرح بالکل ہی آزاد اور خود مختار چھوڑ دینا مفید ہے اور نہ اشتراکیت کی طرح اُسے بالکل ہی باطل قرار دینا مناسب اعتدال کی راہ اسلام ہی کی راہ ہے۔ کہ افراد کو حقوقِ ملکیت تو حاصل ہوں۔ مگر ایسی حدود اور قیود کے ساتھ جو آزاد ملکیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام خرابیوں کا سدِباب کر سکیں۔

غرض یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ شخصی ملکیت کے تصور میں اسلام سوشلزم کی عین ضد ہے اور صرف شخصی ملکیت کا تصوّر ہی نہیں سوشلزم کے دیگر بنیادی اصول بھی اسی طرح اسلام کے اصولوں سے متصادم ہیں۔ انشاء اللہ ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔ کیا اس کے بعد بھی سوشلسٹوں کے اس دعوے میں کوئی وزن رہ جاتا ہے۔ کہ اسلامی سوشلزم کا مفہوم اسلام کا اجتماعی عدل ہے۔

اسلام اور سوشلزم کے اصولوں میں جو بعد المشرقین ہے اس کی بنا پر یہ بات تو اشتراکی حضرات کے بس کی نہیں کہ وہ اپنے مذکورہ دعویٰ کا ثبوت قرآن وسنت سے پیش کر سکیں۔ لے دے کے ان سے جو کچھ بن پڑتا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ اسلام کے پیش کردہ نظریۂ فقر وزہد کو توڑ مروڑ کر اشتراکیت کے ہم معنی قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر ان صحابہؓ کی زندگیاں بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ جنہوں نے غنا کی زندگی پر فقر زہد کی زندگی کو ترجیح دی۔ قرآن وسنت سے اپنے دعوے کی تصدیق تلاش کرنے کی ناکام کوشش میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر دہ آیات واحادیث بیان کرتے

جن میں مال جمع کرنے کی مذمت یا بخل اور امساک کی برائی بیان ہوئی ہے۔
اس سلسلے میں تین باتیں محل نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا واقعی اشتراکیت اور اسلام کا مسلک فقر و زہد باہم مترادف ہیں۔ دوم کیا صحابہ کی اکثریت فقر و زہد کی زندگی ہی پر عمل پیرا تھی اور کیا وہ صحابہؓ جو فقر و زہد کے مقابلے میں غنا یا کفاف کی زندگی کو اپنائے ہوئے تھی، معاذاللہ، اسلامی تعلیمات کی روح سے ناواقف تھے اور سوم یہ کہ کیا فی الحقیقت اسلام کے نزدیک سرمایہ یا مال کوئی قابل مذمت چیز ہے؟۔

مسلک فقر و زہد کی حقیقت

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے۔ تو یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ کہ اشتراکیت کی جبری محرومی اور اسلام کا اختیاری فقر و زہد ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اشتراکیت نجی ملکیت کو سرے سے تمام برائیوں کی جڑ قرار دے کر اُسے بالکل ہی کالعدم ٹھہراتی ہے۔ اور پوری قوم کے تمام وسائل دولت کا جائز مالک صرف حکومت کو سمجھتی ہے جبکہ اسلام کا پیش کردہ مسلک فقر و زہد نجی ملکیت کو پوری طرح برقرار رکھتا ہے وسائل دولت میں قوم کے ہر فرد کو مساوی حقوق عطا کرتا ہے۔ اور پھر اسکے ساتھ ہی مطالبہ کرتا ہے کہ تمام افراد معاشرہ اپنے اختیار سے اپنے اموال کو جمع کر کے نہ رکھیں بلکہ اپنے دوسرے حاجتمند بھائیوں پر خرچ کر دیں تاکہ ارتکاز دولت پیدا نہ ہو اور مال کی گردش فطری طور پر جاری رہے۔ اشتراکیت اور اسلام کے مسلک فقر و زہد میں یہ ایک ایسا بنیادی فرق ہے۔ جو آغاز ہی میں دونوں کے راستے واضح طور پر ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ اور یہ محض ایک دعویٰ ہی نہیں بلکہ

ایک تاریخی حقیقت ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے لے کر تمام صحابہ کرامؓ کی زندگیوں پر نظر ڈال جائیے، جہاں کہیں بھی آپ کو فقر و زہد کی مثالیں نظر آئیں گی وہاں نمایاں طور پر یہ حقیقت بھی ملے گی کہ فقر و زہد کا مطلب عدم شخصی ملکیت ہر گز نہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں وہ دور بھی آئے جب اللہ نے آپ پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے۔ اور آپ مالدار ہو گئے اور جس طرح فقر و زہد کے دور میں آپؐ نے ایک مثالی زندگی گزار کر دکھائی۔ اسی طرح غنا کا بھی آپ نے حق ادا کر دیا اور تمام حقوق واجبہ کے بعد تمام مال مستحق لوگوں پر صرف فرمایا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تعلیمات ہی پہنچانے پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے مجسم عملی نمونے بھی پیش فرمائے۔ جس طرح آپ کی زندگی دیگر مختلف پہلوؤں سے کامل و اکمل تھی۔ اسی طرح فقر و غنا اور کفاف (بقدر ضرورت زندگی گزارنا) کے لحاظ سے بھی جامع تھی۔ آپ کی حیات طیبہ میں فقر، کفاف اور غنا تینوں حالتیں یکے بعد دیگرے پیش آئیں۔ چنانچہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔

جَمَعَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی لِنَبِیِّہٖ الْحَالَاتِ الثَّلٰثَةِ الْفَقْرَ وَالْغِنَا وَالْکَفَافَ۔ (جلد ۱۱۔ صفحہ ۲۱۵۔ شرح بخاری)

"اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تینوں حالتیں فقر و غنا اور کفاف جمع کر دیں۔"

یہی نہیں قرآن پاک میں بھی اس حقیقت کی طرف بصراحت اشارہ موجود ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَوَجَدَكَ عَائِلاً فَاَغْنٰی ۔

" یعنی اللہ نے آپ کو نادار پایا ۔ پس مالدار بنا دیا "

غرض اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آپ کی زندگی میں ایک دور غنا کا بھی آیا ہے ۔ سو اگر مالداری کوئی مذموم چیز ہوتی یا شخصی ملکیت مسلک فقر و زہد کے منافی ہوتی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں کبھی ملوث نہ ہوتے ۔ اس کے علاوہ آپ کی محض نجی زندگی ہی ہمارے سامنے نہیں ہے ۔ آپ حکومت اسلامیہ کے بانی اول بھی ہیں ۔ اپنی زندگی کے آخری تیرہ سالہ مدنی دور میں آپ کو حکومتِ اسلامیہ کے مقتدر اعلیٰ کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے ۔ اگر بقول اشتراکی حضرات اجتماعی ملکیت ہی اسلامی تعلیمات کی اصل روح ہے ۔ تو اپنے مدنی دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کیوں نہ عمل فرمایا اس نظریہ اجتماعی ملکیت پر عمل کرنے کا بہترین موقع وہ تھا ۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہؓ اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ چھاڑ کر انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ ہجرت کر آئے تھے ۔ اجتماعی ملکیت کے اصول کا تقاضا تو یہ تھا ۔ کہ آپ انصار کے تمام اموال و وسائل دولت کا مالک حکومتِ اسلامیہ کو قرار دیتے اور تمام انصار و مہاجرین پر مساوی طور پر تقسیم فرماتے ۔ مگر آپ نے تو اس کے برعکس انصار کے اموال پر ان کے تمام جائز حقوق ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے انصار و مہاجرین میں " مواخاۃ " کا طریقہ قائم کیا تاکہ انصار اپنے اختیار سے اپنے اموال میں تصرف کر کے اپنے مہاجر بھائیوں کی امداد کریں ۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ انصار نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس منشا کو پورا کرنے میں ایثار و قربانی کے کیسے کیسے مظاہرے کیے ۔ جس کے نتیجے میں چند ہی روز

میں مہاجرین اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ پھر انہی انصار و مہاجرین نے مل کر چند ہی سالوں میں ایک مثالی مملکت کی عمارت مضبوط بنیادوں پر استوار کر دی تاریخ کا یہ کرشمہ اجتماعی ملکیت کی بدولت وجود میں آیا یا اس نجی ملکیت کے احترام کا رہین منت رہا ہے جس کو اشتراکیوں کی لغت میں فساد کی جڑ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نہ جانے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس واضح عمل کے باوجود اشتراکی حضرات یہ کہنے کی جسارت کیسے کرتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کی اصل روح اجتماعی ملکیت ہے، نجی یا شخصی ملکیت نہیں۔ ان کا یہ دعویٰ، جیسا کہ میں شروع میں ذکر کر آیا ہوں، قرآن و سنت سے تو کسی طرح ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اسلام کے مسلک فقر و زہد کو اشتراکیت کی حمایت میں پیش کرنے والوں سے میں پوچھتا ہوں۔ کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زاہدانہ زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے آپ کی زندگی کے اس دور کو کیوں بھول جاتے ہیں۔ جو غنا کا ایک مکمل نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس بنیادی فرق کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں جو اسلامی فقر و زہد اور اشتراکیت کی جبری محرومی کے لیے دو متضاد راہیں متعین کرتا ہے۔

کیا ان کی نظر میں جبر و اختیار ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟ کیا عطا اور ڈکیتی ان کی لغت میں ہم معنی الفاظ ہیں؟ کیا نفس کے غنا کی صفت سے متصف قناعت پذیری اور سب کچھ چھن جانے پر بامر مجبوری صبران اشتراکی حضرات کے نزدیک ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں؟ اگر ان سب کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اسلام کا مسلک فقر و زہد اور اشتراکیت کے نتیجہ میں پیدا شدہ افلاس محض دو جداگانہ حقیقتیں ہیں جن کے درمیان کسی درجہ

میں بھی کوئی مشابہت نہیں۔ یہ دونوں نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ پہ اشتراکی طرزِ عمل کا الزام

اشتراکی حضرات اشتراکیت کو اسلام کے عین مطابق ثابت کرنے کے لیے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے حوالے بھی اکثر و بیشتر دیا کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں تمام دولت مندوں کے ذاتی اموال کا جائزہ لے کر تمام زائد از ضرورت املاک کو بحق سرکار ضبط کر لیا تھا۔ حالانکہ اس دعویٰ کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تھا تو حضرت عمرؓ اس کے پاس جس قدر مال و اسباب ہوتا تھا، اس کی ایک مکمل فہرست تیار کرا کر اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ اور بعد میں اگر عامل کی حالت میں کوئی غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو آپ اس سے مواخذہ فرماتے تھے اور اس کی املاک کا جائزہ لے کر مشتبہ اموال اس سے لے کر بیت المال میں داخل فرما دیتے تھے۔ اپنے عمّال کے ساتھ حضرت عمرؓ کے اس سلوک کو زائد از ضرورت اموال کی بحقِ سرکار ضبطی قرار دینا سر بسر بددیانتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپؓ کی پالیسی یہ تھی کہ رفتہ رفتہ دولت مندوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر تاریخ کے اوراق حضرت عمرؓ کا عمل ان کی اس مبینہ پالیسی کے برخلاف ظاہر کرتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانیؒ "الفاروق" میں میغۂ محاصل کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

"جو لوگ قدیم سے زمیندار اور تعلق دار تھے۔ اور جن کو ایرانی زبان میں مرزبان اور دہقان کہتے ہیں حضرت عمرؓ نے ان کی حالت اسی طرح

قائم رکھی اور ان کے جو اختیارات اور حقوق تھے سب بحال رکھے "

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے دولت مندوں کا خاتمہ کرنے کی بجائے سابقہ جاگیر داروں کو بھی اپنے اختیارات اور حقوق پر بحال رکھا اور ان کی سابقہ حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اگر حضرت عمرؓ دولت مندوں کو ختم کرنے کی پالیسی کے حامل تھے تو آپؓ کا عمل اس سے مختلف کیوں تھا اور پھر یہی نہیں "الفاروق" ہی کے مطابق آپ نے مسلمانوں کو ان کی اسلامی خدمات کے صلے میں جاگیریں بھی عطا کیں جو کسی حال میں بھی خراج یا عشر سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ حیرت ہے کہاں دولت مندوں کو ختم کرنے کی پالیسی اور کہاں مسلمانوں کو جاگیروں کا مالک بنانا۔ غرض بات وہیں آکر ختم ہوتی ہے کہ اشتراکیت کو اسلام سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ دراصل دولت مندی اور دولت پرستی دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اور اسلام کا مسلک فقر و زہد دولتمندی کا نہیں دولت پرستی کا دشمن ہے۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت ابوذر غفاریؓ کے مذہب و مسلک کو بھی اشتراکیت کی حمایت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ آپؓ کا مطالبہ محض اتنا تھا کہ دولت مند اپنے اموال کو جمع کر کے نہ رکھیں بلکہ جو کچھ آئے اسے فوراً حاجت مندوں پر خرچ کر دیں۔ قرآن کریم کی جس آیت کو آپ بار بار اپنے مسلک کی تائید میں پیش فرماتے تھے۔ وہ خود اس حقیقت کی گواہ ہے کہ آپ شخصی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے فقر و زہد کا مسلک اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ سورۃ توبہ کی اس آیت۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ

بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ میں دلا ینفقونھا سے صاف عیاں ہے۔کہ جب
تک کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہ ہو۔اس کے خرچ کرنے یا نہ کرنے کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب ایک مال میں کسی کو تصرف کا حق ہی حاصل نہیں
تو اس کے خرچ نہ کرنے پر عذاب کی وعید کے کیا معنی؟ دراصل اس آیت
میں مال جمع کرنے والوں پر جو وعید آئی ہے حضرت ابوذر غفاریؓ اس میں
اس شخص کو بھی شامل سمجھتے تھے جس نے زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی کچھ مال اپنی
آئندہ ضروریات کے لیے بچا رکھا ہو۔اس کے برخلاف جمہوری صحابہ کی
رائے یہ تھی کہ اس کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو زکوٰۃ واجبہ ادا نہ
کرتے ہوں۔ظاہر بات ہے کہ حضرت ابوذرؓ کے اختلاف کی نوعیت محض
اتنی ہے کہ آپ صرف زکوٰۃ واجبہ کی ادائیگی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے
بعد صدقات وخیرات کو بھی واجب کا درجہ دیتے ہیں۔غور کا مقام ہے کہ
زکوٰۃ کون سے مال پر واجب ہوتی ہے؟ اسی مال پر جو زائد از ضرورت
ہو، اور کسی شخص کی ملکیت میں پورے ایک سال رہا ہو۔ حضرت ابوذرؓ
غفاریؓ کے مسلکِ فقر وزہد کی جو تعبیر اشتراکی حضرات کرتے ہیں، اس کی رو
سے تو زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔جب ذاتی ملکیت ہی نہیں۔ تو
سال گزرنے اور زکوٰۃ واجب ہونے کا کیا ذکر؟ حضرت ابوذرؓ کے اس
واضح مسلک کو اشتراکیت سے تعبیر کرنا حضرت ابوذرؓ کی توہین ہی نہیں،
اسلام کو مسخ کرنے کی ایک مذموم کوشش ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہو یا صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیاں، ان حضرات

کا طریقہ فقر و زہد ہو یا مسلک غنا اشتراکی نظریات کی خرافات سے انہیں دور کی بھی نسبت نہیں۔ سوشلسٹ حضرات خواہ کیسی ہی دور از کار تاویلات کیوں نہ کریں اسلامی فقر و زہد اور اشتراکیت کو باہم مترادف ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

صحابہؓ کی زندگیاں اور ان سے استدلال

اس سلسلے میں دوسرا غور طلب پہلو یہ ہے، کہ فقر و زہد جس سے اشتراکیت کی حمایت میں دلیل پکڑی جاتی ہے کیا صحابہؓ کی اکثریت اس پر عمل پیرا تھی بلکہ کیا وہ صحابہؓ جنہوں نے فقر و زہد کو اختیار نہ کیا تھا۔ معاذ اللہ اسلامی تعلیمات کی روح سے ناواقف تھے؟

دراصل اسلامی فقر و زہد کو اشتراکیت کی حمایت میں پیش کرتے ہوئے اشتراکی حضرات یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمام اسلامی تعلیمات کا لب لباب محض فقر و زہد ہے اور اس مسلک سے ہٹ کر اگر کوئی اسلام کی بات کرتا ہے تو وہ اسلامی تعلیمات کی روح سے ناواقف ہے۔ حالانکہ صحابہؓ کی اکثریت کے علاوہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جیسا کہ میں اوپر ثابت کر آیا ہوں، اپنی حیات طیبہ کا ایک دور غنا کی حالت میں بسر فرماتے رہے ہیں۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے متعدد صحابہؓ غنا کی دولت سے مالا مال تھے۔ مگر آپ نے ان پر کوئی گرفت فرمانے کی بجائے ان کے اموال میں برکت اور زیادتی کی دعا فرمائی۔ حضرت عثمانؓ غنی حضرت عبدالرحمان بن عوف، حضرت انسؓ بن مالکؓ اور حضرت زبیرؓ بن العوامؓ کے اسمائے گرامی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب حضرات اغنیاء میں شمار ہوتے تھے مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے مقربین صحابہ میں سے تھے۔ ان حضرات کے علاوہ ایسے صحابہؓ کم تعداد میں تھے۔ جنہوں نے فقر و زہد کو اختیار کیا ہوا تھا۔ اکثریت ایسے ہی صحابہؓ کی تھی جو غنا یا کفاف کو اختیار فرمائے ہوئے تھے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی اسی موضوع کے سلسلے میں ایک موقعہ پر فرماتے ہیں۔

وَدَعْوٰی اَنَّ جُمْهُوْرَ الصَّحَابَةِ کَانُوْا عَلَی التَّقَلُّلِ وَالزُّهْدِ مَمْنُوْعَةٌ بِالْمَشْهُوْرِ مِنْ اَحْوَالِهِمْ فَاِنَّهُمْ کَانُوْا عَلٰی قِسْمَیْنِ بَعْدَ اَنْ فُتِحَتْ عَلَیْهِمُ الْفُتُوْحُ فَمِنْهُمْ مَنْ اَبْقٰی مَا بِیَدِهٖ مَعَ التَّقَرُّبِ اِلٰی رَبِّهٖ بِالْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْمُوَاسَاةِ مَعَ الْاِتِّصَافِ بِغِنَی النَّفْسِ وَمِنْهُمْ مَنِ اسْتَمَرَّ عَلٰی مَا کَانَ عَلَیْهِ وَهُمْ قَلِیْلٌ بِالنِّسْبَةِ لِلطَّائِفَةِ الْاُخْرٰی۔ (فتح الباری: جلد ۱۱: ص۲۴)

"یہ دعویٰ کہ اکثر صحابہؓ فقر و زہد کی حالت پر تھے ان کے مشہور حالات کی بنا پر قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ صحابہؓ فتوحات کے بعد دو قسم پر تھے۔ بعض نے غنائے نفس کی صفت سے متصف ہونے کے باوجود اپنے اموال کو اپنے پاس رکھا۔ اور نیکی، صلہ رحمی اور غمخواری کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کیا۔ اور بعض اپنی پہلی ہی حالت پر قائم رہے (یعنی فقر پر) اور یہ لوگ پہلی جماعت کی نسبت قلیل تھے۔"

(فتح الباری جلد نمبر ۱۱ صفحہ ۲۱۷)

معلوم ہوا کہ اکثر صحابہؓ غنی تھے اور ایسے صحابہؓ بہت قلیل تعداد میں

تھے جنہوں نے مسلک فقر و زہد کو اختیار کیا تھا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اشتراکی حضرات اپنے نظریات کی حمایت میں ان صحابہؓ کی زندگیاں تو پیش کرتے ہیں۔ جو فقر و زہد پر عمل پیرا تھے مگر قلیل تھے۔ اور ان صحابہؓ کو قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی زندگیاں غنا کی دولت سے مالا مال تھیں، اگرچہ ایسے صحابہؓ کثیر تعداد میں ہیں۔ دراصل صحابۂ کرامؓ کی زندگیاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا مکمل نمونہ ہوتی تھیں مگر مختلف صحابہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی ایک پہلو زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا۔

اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ۔

(مشکوٰۃ: باب مناقب الصحابہ۔ فصل ۳)

چنانچہ اگر بعض صحابہؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و زہد کا نمونہ تھے تو دیگر کثیر صحابہؓ ایسے بھی تھے جن پر آپ کی زندگی کے دور غنا کا رنگ غالب تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ فقر و زہد یا غنا و کفاف میں سے کسی بھی ایک حالت کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ ہر شخص کے لیے ہر وقت موزوں ہے انتہائی غلط ہے۔ ان میں سے ہر حالت کا موزوں یا ناموزوں ہونا ہر شخص کی صلاحیت اور اس کے مخصوص حالات پر موقوف ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی یہی شان تھی کہ آپ جنگ تبوک کے موقعہ پر اپنا کل اثاثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر نثار کر دیں، چنانچہ آپ نے نثار کر دیا۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایسا کرنے سے منع نہ فرمایا لیکن حضرت عمرؓ

کے لیے اس کے بالمقابل یہ موزوں تھا کہ وہ اپنا نصف اثاثہ اپنے اور اپنے گھر والوں کیلئے بھی بچا رکھیں۔ چنانچہ آپ نے بچا رکھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس کی اجازت دی۔ حضرت کعب بن مالک ایک مرتبہ اپنا سارا مال راہِ خدا میں صرف کر دینے کے ارادے کا اظہار کرتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ایسا کرنے سے روک دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

اَمْسِكْ عَلَيْكَ بَعْضَ مَالِكَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكَ ۔

(بخاری جلد ۱ ص ۱۹۳)

(اپنے لیے بھی کچھ مال روک رکھ کر وہ تیرے لیے خیر ہے۔)

معلوم ہوا کہ جو صحابہؓ فقر و زہد پر عمل پیرا تھے۔ ان کے لیے فقر و زہد ہی مناسب تھا۔ اور جنہوں نے غنا اختیار کیا تھا ان کے لیے غنا ہی موزوں تھا۔ اسلام نہ فقر و زہد کا پابند کرتا ہے نہ غنا کا اس لیے ان میں سے کسی ایک کو اسلام کے مطابق اور کسی دوسرے کو اسلام کے منافی قرار دینا نادانی اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

اب تک کی بحث سے قارئین پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ اشتراکیت اور اسلام کا پیش کردہ مسلک فقر و زہد باہم مترادف نہیں بلکہ متضاد نظریات ہیں اور یہ بھی مخفی نہ رہا ہو گا۔ کہ صحابہؓ میں اکثریت ان صحابہؓ کی ہے۔ جن کی زندگیوں پر فقر و زہد کا نہیں بلکہ غنا یا کفاف کا رنگ غالب تھا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ محض فقر و زہد پر ہی اسلامی زندگی کا انحصار نہیں ہے۔

کیا مطلق سرمایہ فی الواقع مذمّت کی چیز ہے

اسلامی سوشلزم کے کسی دوسرے مبینہ مفہوم پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ ان آیات واحادیث کے پیش نظر جن میں مال جمع کرنے کی مذمّت یا بخل اور امساک کی برائی بیان ہوئی ہے، کیا فی الواقع اسلام کے نزدیک سرمایہ یا مال کوئی قابل مذمّت چیز ہے ؟ دراصل اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل غور امر یہ ہے کہ جہاں ہمیں ایسی آیات واحادیث ملتی ہیں۔ جن میں مال کی مذمّت بیان ہوئی ہے وہاں قرآن وسنت میں ہمیں ایسے شواہد بھی نظر آتے ہیں۔ جو مال کے حق میں مدح کے حامل ہیں۔ ان دونوں قسم کی آیات واحادیث کا تتبع کرنے سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دراصل دولتمندی اور دولت پرستی دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اسلام کے نزدیک دولت پرستی قابلِ مذمت چیز ہے، دولتمندی نہیں۔ اگر ایک آدمی دولت مند ہے۔ مگر تمام حقوق واجبہ ادا کرتا ہے۔ نیکی، صلہ رحمی۔ اور غم خواری وہمدردی کے ذریعے خدا کے قرب کا خواہش مند رہتا ہے، تو ایسا شخص اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اس کے برعکس ایک دولت مند ہے مگر بخل اور امساک کی لعنت میں گرفتار ہے، مال کی محبت اس کے دل پر قابض ہے، تو اللہ اور اسکے رسول کے نزدیک ایسا شخص مغضوب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک مال دار ہونا مذموم نہیں، مال کی محبت میں گرفتار ہونا مذموم ہے۔ قرآن کریم میں ہمیں جتنی آیات مال کی مذمّت میں ملتی ہیں۔ ان سب میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمایئے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ

فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (آل عمران : ۱۷۹)

"اور جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں۔ جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے، نہیں بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے۔ یقیناً انہیں قیامت کے دن طوق پہنایا جائے گا۔"

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (سورۃ توبہ ۷۵)

"اور ان میں وہ بھی ہیں جو اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں (مال) عطا کر دے تو ہم خوب تصدق کریں گے اور خوب نیک کام کیا کریں گے۔ پھر جب ان کو اللہ نے اپنے فضل سے (مال) دے دیا تو لگے اس میں بخل کرنے اور روگردانی کرنے اور منہ پھیرے ہوئے تو وہ تھے ہی۔"

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ (سورۃ فجر : ۱۹)

"یہ بات نہیں، اصل یہ ہے کہ تم لوگ یتیم کی قدر نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے ہو اور میراث کا

کا سارا مال سمیٹ کر رکھے جاتے ہو اور مال سے بہت زیادہ
محبت رکھتے ہو۔"

ان آیتوں میں اور اسی قسم کی دیگر آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مال
داروں کی مذمت ان کے مالدار ہونے کی حیثیت سے نہیں کی جارہی بلکہ ان
کے حبّ مال کے جذبے کی بنا پر کی جارہی ہے۔ معلوم ہوا کہ سرمایہ بذاتِ خود
اسلام کے نزدیک کوئی مذمت کی چیز نہیں ہے اگر مال و دولت بطور مال و دولت
کوئی مذمت کی چیز ہوتا تو قرآن کریم میں جا بجا مال کی مدح نہ ہوتی۔ قرآن کہیں
مال کو خیر کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ کہیں اسے "قیٰما" کہہ کر پکارتا ہے۔
سورۃ البقرۃ میں ہے:۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی
وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ (البقرۃ: ۲۱۵)

"آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ مال سے خرچ کرنا ہے۔ سو وہ حق ہے والدین
کا عزیزوں کا اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا۔"

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ
وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ
لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ: ۲۷۲)

"اور تم جو کچھ بھی مال میں سے خرچ کرتے ہو۔ سو اپنے لیے ہے۔ اور
تم اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہو، اور تم مال میں سے جو کچھ بھی
خرچ کرتے ہو (سب) تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا۔ اور تم پر (ذرا بھی)

زیادتی نہ کی جائے گی۔

ان آیات میں مال کو خیر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ نساء میں مال کو قیٰما یعنی مایۂ زندگی فرمایا۔ جو یقیناً مال کی مدح ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا۔ (سورۃ النساء: ۵)

"اور کم عقلوں کو اپنا وہ مال نہ دے دو جس کو اللہ نے تمہارے لیے مایۂ زندگی بنایا ہے۔ اور اس مال میں سے انہیں کھلاتے اور پہناتے رہو۔ اور ان سے بھلائی کی بات کہتے رہو۔"

قرآن کریم کے علاوہ احادیث نبوی بھی اس پر شاہد ہیں کہ مال بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں۔ مال کی وہ محبت جو بخل و امساک پر منتج ہو وہ بُری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"نِعْمَ الْعَوْنُ عَلَىٰ تَقْوَى اللَّهِ الْمَالُ"

(کنز العمال: جلد ۲: ص ۵۰)۔

"اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے میں مال بڑا اچھا مددگار ہے۔"

ایک موقعہ پر فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ۔

(مشکوٰۃ: کتاب الرقاق: المال والعمر)

"اللہ تعالیٰ متقی مالدار اور خدا کی راہ میں پوشیدہ طور پر خرچ کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔"

غرض اس حقیقت سے کوئی بھی اہل علم انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن وسنت سے مطلق سرمایہ داری کو مذموم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کے نزدیک جو چیز معیوب ہے۔ وہ سرمایہ پرستی ہے جو انسان کے اندر بخل و امساک جیسے رذائل خبیثہ پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

یہ تھی ساری حقیقت اشتراکی حضرات کے اس دعوے کی کہ اسلامی سوشلزم اور اسلامی اجتماعی عدل ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ اپنے اس دعوے کو قرآن وسنت سے تو خیر وہ ثابت کر ہی نہیں سکتے تھے، لیکن اسلام کے فقر و زہد کے مسلک کو کھینچ تان کر اشتراکیت کے ہم معنی ثابت کرنے کے لیے جو تانا بانا یہ اشتراکی حضرات بنتے رہتے ہیں۔ دلائل کی روشنی میں اس کا تار و پود بکھرتا بھی قارئین نے دیکھ ہی لیا ہے۔ آئیے اب ذرا عقل کی کسوٹی پر اشتراکی حضرات کے اس دعوے کو بھی پرکھ لیں کہ اسلامی سوشلزم اسلامی مساوات کے ہم معنی ہے۔

کیا اسلامی سوشلزم اسلامی مساوات کے ہم معنی ہے؟

اسلامی سوشلزم کے علم برداروں کا یہ دعویٰ کہ اشتراکی نظام کی مساوات اسلامی مساوات کے ہم معنی ہے۔ محض ایک ایسے دعوے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی پشت پر ایک بھی مضبوط دلیل موجود نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا دھوکہ تو یہ ہے کہ اسلامی مساوات ایک ہمہ جہتی مساوات ہے۔ جس کا دائرہ زندگی کے تمام اہم گوشوں پر محیط ہے۔ جب کہ اشتراکی مساوات محض اقتصادی مساوات سے

تعبیر ہے۔ انسانی زندگی کے دوسرے گوشوں سے اشتراکیت کو کوئی واسطہ نہیں اور
اسی لیے ان کی درستی و نادرستی سے بھی اسے کوئی غرض نہیں۔ دوسرا بڑا فریب
اس سلسلے میں یہ ہے کہ اشتراکیت نے اقتصادی مساوات کا نظریہ پیش کرتے
ہوئے اس کے فطری اور غیر فطری فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اور ایسا انتہا پسندانہ
رویہ اختیار کیا جو غیر فطری ہونے کی بنا پر ناممکن العمل ہے۔ اس کے مقابلے
میں اسلام نے اپنے دوسرے نظریات کی طرح مساوات کے نظریہ میں بھی راہِ
اعتدال اختیار کی۔ اور مساوات کا ایسا فطری نظام قائم کیا۔ جو ممکن العمل ہونے
کے ساتھ ساتھ پوری انسانی زندگی کی اصلاح میں ممد و معاون ثابت ہوا۔
اشتراکی اور اسلامی مساوات کے درمیان یہ دونوں فرق ایسے ہیں۔ جو بنیادی
حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اشتراکی حضرات فریقِ مخالف کی توجہ ان سے ہٹانے
کے لیے بڑی چالاکی سے اپنی چرب زبانی کا سہارا لیتے ہیں، اور محض اس بات
سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مساوات کا لفظ اشتراکیت اور اسلام
دونوں نظریات میں مشترک ہے۔

اِسلام محض اقتصادی مساوات ہی کا نظریہ پیش نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی
کے دوسرے گوشوں کے لیے بھی وہ ایک بامقصد مساوات کا علمبردار ہے۔
اور اس لحاظ سے اسلام کا نظریۂ مساوات اشتراکیت کی محدود اقتصادی مساوات
کے مقابلے میں بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔ نفسِ مضمون کو ذرا بآسانی سمجھنے کے لیے
مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مساوات کو چند عنوانوں میں تقسیم کر لیا جائے اور پھر
دیکھا جائے کہ اسلام اور اشتراکیت کا ان کے بارے میں کیا طرزِ عمل ہے؟

انسانی مساوات

اسلام کی نظر میں تمام انسان اپنی اصل کے لحاظ سے برابر ہیں سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اس لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ رشتہ میں منسلک ہیں۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (النساء: ۱)

اے بنی نوع انسان اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا۔

کیونکہ سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔ اس لیے نسل، رنگ، زبان اور وطن کے لحاظ سے ان میں کوئی تفریق نہیں۔ البتہ صرف تعارف کے لیے مختلف قوموں اور مختلف قبائل کے نام سے ان میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ط (الحجرات: ۱۳)

اے بنی نوع انسان ہم نے تمہیں عورت اور مرد سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف قبائل بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو۔

اگر تمام انسان یکساں ہوتے تو ان میں تمیز نہ کی جا سکتی اس لیے اللہ نے جہاں الگ الگ غرض سے مختلف شکلیں عطا فرمائیں، وہاں ان کی زبانیں، ان کے رنگ ان کی جائے سکونت بھی مختلف رکھی مگر یہ سب کچھ فضیلت کی خاطر نہیں۔ بلکہ باہم تمیز کی غرض سے ہے۔ کسی شخص، کسی برادری کسی قبیلے اور کسی قوم کو ایک دوسرے

پر اپنی اصل کے اعتبار سے کوئی فضیلت نہیں۔ عربی ہو یا عجمی، کالا ہو یا گورا، آقا ہو یا نوکر، امیر ہو یا غریب، سرمایہ دار ہو یا مزدور، اسلام کی نظر میں سب برابر ہیں۔ ہاں اگر انسانوں کے درمیان فضیلت کی کوئی بنیاد ہے تو وہ اخلاقی کردار ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔

(حجرات: ۱۳)

بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک فضیلت والا وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

اسی بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا:

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى وَلَا فَضْلَ لِلْاَنْسَابِ۔ (زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۱۸۵)

"کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر، اور نہ کالے کو گورے پر، سوائے تقویٰ کے اور نسبی بنیادوں پر کوئی فضیلت نہیں۔"

اسلام کے مقابلے میں اشتراکیت کہتی ہے کہ انسان کسی آدم اول کی اولاد نہیں۔ بلکہ (Survival of the fittest) یعنی بقائے برتر کے اصول کے تحت ایک ترقی یافتہ معاشی حیوان ہے، اور چونکہ فطری طور پر خود غرض، لالچی اور کمزور کو دبانے کا عادی واقع

ہوا ہے، اس لیے ابتدا ہی سے دو طبقوں میں تقسیم چلا آرہا ہے۔ ایک ناجائز طور طریقوں سے لوٹنے والا اور دوسرا لٹنے والا۔ ایک بورژوا سرمایہ دار اور دوسرا پرولتاری مزدور۔ چنانچہ ضروری ہے کہ لٹنے والوں پرولتاریوں کو منظم کرکے لوٹنے والے طبقے یعنی سرمایہ داروں کو ختم کردیا جائے۔ گویا اشتراکیت اپنے نظریے کی بنیاد ہی طبقاتی جنگ پہ رکھتی ہے۔ اور اپنے نصب العین کے حصول کے لیے معاشرہ کو طبقات میں تقسیم کرتی ہے۔ اگر طبقات موجود نہ ہوں۔ تو مصنوعی تقسیم اور اختلاف کو بروئے کار لاتی ہے غربت اور امارت کے جھگڑے، علاقائی اور لسانی تفریقیں، برادریاں اور کنبوں کے فسادات ثقافت اور کلچر کے فتنے، غرض جس طرح بھی انسانوں کو باہم لڑایا اور ٹکڑے ٹکڑے کیا جاسکتا ہے، اشتراکیت سب کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کو انسان کا بھائی نہیں بلکہ دشمن بناتی ہے۔

سیاسی مساوات

اسلام کے نزدیک انسان کائنات میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہے اور اللہ تعالیٰ کے نائب ہونے کی حیثیت سے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ یہاں اپنے آقا کا حکم جاری کرے۔ چونکہ یہ منصب نیابت بنی نوع انسانی کو فرداً فرداً حاصل ہے اس لیے ہر شخص کو انفرادی طور پر حکومت و سیاست میں برابر کی شرکت کا پورا پورا حق ہے۔ اس حق میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ جو شخص بھی یہ اقرار کرے کہ وہ اس زمین میں اپنے خالق و

مالک کے حکم کا نفاذ کرے گا اس کی راہ میں حکومت کے بڑے سے بڑے منصب تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ وہ امیر ہو یا غریب، آزاد ہو یا غلام، عربی ہو یا عجمی، کسی نسل، کسی بھی مقام اور کسی بھی طبقہ سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو پوری طرح اس بات کا اہل ہے کہ حکومت کے کلیدی مناصب پر فائز ہو سکے، حکومت و سیاست میں پورا پورا حصہ لے سکے حتیٰ کہ ایک معمولی ترین شخص خلیفۃ المسلمین کے منصب تک پہنچنے کا پوری طرح اہل ہے۔ اس کے برخلاف اشتراکیت کے سیاسی نظام کی بنیاد بھی طبقاتی جنگ پر رکھی گئی ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک بورژوا سرمایہ دار تو بالکل خارج از بحث ہے۔ حکومت میں شرکت کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے اس کو تو جینے کا بھی حق نہیں رہا۔ پرولتاری مزدور تو اشتراکی حکومت میں محض کہنے کی حد تک پرولتاری مزدوروں کی حکومت ہے۔ ورنہ فی الحقیقت چند پارٹی لیڈر ہی ساری قوت کا منبع و مرکز ہیں۔ پرولتاری مزدور بے چارے کو کون پوچھتا ہے۔ ان کو تو اپنی رائے تک کا اظہار آزادی سے کرنے کی اجازت نہیں جا سکتی ہے جمہوریت اور شورائیت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتخابات محض ایک تماشا پورے ملک میں صرف ایک پارٹی ہر حلقہ سے اسی کے نمائندے مقابل میں کوئی دوسرا امیدوار نہیں، ایسی صورت میں ہار جیت کا کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا۔ غرض اشتراکی حکومت میں شرکت کے لحاظ سے معدودے چند پارٹی لیڈرز کو چھوڑ کر تمام افراد معاشرہ ایک عضو معطل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ملک کے تمام سیاہ و سفید کا مالک سوشلسٹ پارٹی کا لیڈر ہوتا ہے۔

ایک ایسا آمر مطلق کہ ساری ملکیتیں اس کے قبضے میں سارے وسائل دولت اس کے ہاتھ میں، اقتدار کی پوری مشنری اس کے خم ابرو کی منتظر۔ نام بے چارے پرولتاری مزدور کا استعمال ہوتا ہے اور پورے ملک میں خدائی اختیارات کا مالک سوشلسٹ آمر ہوتا ہے۔

قانونی مساوات

قانونی مساوات کا جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے۔ انسانی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے صرف اسی کو حق ہے کہ اس زمین میں وہ اپنا قانون جاری کرے۔ اس زمین پر بسنے والے سب اس کے بندے ہیں اور اس لحاظ سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ چنانچہ خدائی قانون کی نظر میں بھی سب برابر ہیں۔ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی جو حدود عوام کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ وہی ارباب اقتدار کے لیے بھی بعینہٖ نافذ العمل ہیں۔ قتل ناحق کی سزا جو ملک کے ایک عام باشندے کو دی جا سکتی ہے وہی سزا ملک کے حاکم اعلیٰ کو بلحاظ منصب و مقام دی جائے گی۔ بغاوت کی جو حد عام آدمی کیلئے متعین ہے اگر حل و عقد کے ارباب میں سے کوئی اس کا مرتکب ہو تو اس پر بھی وہی حد جاری کی جائے گی۔ اسی طرح دیگر حدود کا حال ہے۔ غرض کوئی بھی قانون خواہ وہ افراد معاشرہ کے حقوق سے متعلق ہو یا ان کے فرائض سے وابستہ ہو۔ اپنے نفاذ میں افراد معاشرہ کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ اسلام اس کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ کہ کوئی شخص یا انسانوں کا کوئی گروہ ان قوانین میں ذرہ برابر بھی کوئی تبدیلی کرے۔ اپنی طرف سے جو چاہے گھڑ لے۔ اور

زبردستی جس پر چاہے مسلط کر دے، اور پھر کسی کو لب ہلانے بھی نہ دے۔ اسلام نے اپنے آئین کی تمام حدود متعین کر دی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان سے ذرا بھی انحراف کرے، وہ خواہ کسی بھی مقام و منصب کا مالک کیوں نہ ہو۔ ہر شخص کو اس پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ ہر قسم کی آزادی، انفرادی ہو یا اجتماعی، کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس پر قدغن لگائے۔ مختصر یہ کہ اسلامی قانون کی نظر میں شاہ و گدا۔ آقا و غلام، امیر و غریب سب برابر ہیں۔

اس کے بالمقابل ذرا اشتراکیت پر نظر ڈالیے۔ ایک طرف اشتراکی آمد اور اس کے چند ساتھیوں کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ انسانوں پر حکومت کرنے کے لیئے جو فلسفہ چاہیں گھڑیں، جو قانون چاہیں بنالیں اور اس کو پولیس فوج اور جاسوسی نظام کے بل بوتے پر پوری قوم پر مسلط کر دیں۔ دوسری طرف قوم کے کسی فرد کو ان کے خود ساختہ فلسفہ اور ان کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف ایک لفظ تک زبان سے نکالنے کا حق نہیں۔ ایک جانب یہ آزادی کہ مٹھی بھر چند پارٹی لیڈر پوری قوم میں سے جس کو چاہیں ذرا سے شک کی بنا پر جبری محنت کے کیمپ میں جھونک دیں اور جسے چاہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ دوسری جانب یہ پابندی کہ کوئی انکے ظلم کے خلاف آواز تک نہ اٹھائے۔ کیا یہ انصاف ہے کہ اشتراکی پارٹی کے معدودے چند ممبر تو اپنے خود ساختہ فلسفہ کی ترویج کے لیے ملک کے تمام وسائل و ذرائع استعمال کر سکتے ہوں۔ اور ہر قسم کی تنظیمیں بنا سکتے ہوں مگر عوام میں سے کوئی دو آدمی بھی مل کر کوئی تنظیم یا جماعت نہ بنا سکیں۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ملک کے تمام زمینداروں اور کارخانہ داروں کو تو اجتماعی بہبود کے نام پر بے دخل

کر دیا جائے اور ملک کے تمام وسائل دولت صرف ایک زمیندار یا کارخانہ دار کو بخش دیئے جائیں۔ جس کا نام حکومت ہو ایک طرف حکومتی پارٹی کے چند گنے چنے افراد اپنی من مانی کرتے رہیں۔ ملک کی تمام دولت پر جس طرح چاہیں تصرف کریں اور دوسری طرف کروڑوں عوام جانوروں کی طرح ہر اس کام کے کرنے پر مجبور ہوں جو یہ مٹھی بھر افراد ان کے لیے متعین کریں کسی کو اپنی مرضی کا پیشہ تک اختیار کرنے کا حق حاصل نہیں۔ کیا یہی ہے۔ وہ اجتماعی بہبود جو اشتراکیت کا طرۂ امتیاز ہے۔

معاشی مساوات

معاشی مساوات کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر معلوم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکیت اس سلسلہ میں جو نظریہ پیش کرتی ہے۔ اس پر ایک تحقیقی نظر ڈال لی جائے۔ کیونکہ معاشی مساوات ہی وہ بنیاد ہے جس پر اشتراکیت کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے اور یہی وہ پر فریب نعرہ ہے جو اشتراکیت کے جال کے تانے بانے کا کام دیتا ہے۔ چونکہ اشتراکیت کی نظر میں معیشت ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد انسانی زندگی کے دوائر گردش کرتے ہیں۔ اس لیے بھی معاشی مساوات کو اشتراکیت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اگر اشتراکیت کا یہی بنیادی نظریہ معاشی مساوات ہی محض ایک فریب ثابت ہو جائے اور دلائل کی روشنی میں اس کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ کچھ نہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ سرے سے اشتراکیت ہی کا تار و پود بکھر گیا۔

دراصل معاشی مساوات کا نظریہ پیش کرتے ہوئے اشتراکیت نے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں کے درمیان فطری اور

غیر فطری اختلاف کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا اور ہر قسم کے اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انسانوں کے درمیان فطری اختلاف کو بھی مٹانے کی کوشش کا مطلب انسانی فطرت سے جنگ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا آج تقریباً پچاس برس گزرنے کے باوجود بھی اشتراکیت کا کامل معاشی مساوات کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ کسی نظریہ کا بہترین زمانہ اس کا اولین زمانہ ہوا کرتا ہے۔ اگر پہلے پچاس سال ہی میں وہ مزعومہ کامل معاشی مساوات قائم نہیں ہو سکی تو آئندہ اس کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ اشتراکیت نے دعویٰ کیا تھا کہ میرا معاشی نظام سب لوگوں سے ان کی صلاحیت کے مطابق کام لے گا۔ اور سب لوگوں کی ضرورت کے مطابق اُجرت دے گا اور اس طرح پوری قوم میں کامل مساوات کا دور دورہ ہو گا۔ لیکن جب لوگوں میں دماغی اور جسمانی صلاحیتیں مساوی نہیں تو ان کی مساعی بھی مساوی ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ لہٰذا یہ بالکل غیر فطری بات تھی کہ مساعی برابر نہ ہوں۔ مگر نتائج میں برابر کی حصہ داری ہو۔ نتیجہ سامنے ہے کہ مساوات کا یہ غیر فطری تصور پہلے ہی قدم پر شکست کھا گیا۔ تمام اشتراکی ریاستوں میں اُجرتوں کا حال سرمایہ دار ملکوں سے بھی بدتر ہے۔ روس میں معاوضوں کے درمیان ایک اور پچاس کی نسبت واضح طور پر موجود ہے۔ روس کا مزدور آج بھی چند سو روبل معاوضے پر جوں توں گزارا کرتا ہے اور اسکے کارخانوں کے ڈائریکٹر آج بھی ساڑھے تین ہزار روبل تک وصول کرتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے مزدوروں کو معاشی مساوات کے نام پر بلایا تھا۔ وہ بیس بیس ہزار اور پچاس ہزار روبل تک معاوضہ پاتے ہیں۔ یہی نہیں الٹے جبری محنت کے کیمپ کھول دیئے گئے ہیں۔ جہاں مزدور کو ان چند روبل سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ صرف روٹی کپڑے کی قلیل مقدار اور پولیس کے ڈنڈے کے زور سے انتہائی محنت ومشقت

کے کام لاکھوں مزدوروں سے مفت کرائے جاتے ہیں۔ ان کیمپوں کو زیادہ سے زیادہ آباد رکھنے اور بیش از بیش کار آمد بنانے کی خاطر لاکھوں انسانوں کو طرح طرح کے الزامات لگا کر اور قسم قسم کی تطہیری مہمات چلا کر ان میں جھونک دیا جاتا ہے۔ تمام اشتراکی ممالک میں روز کی روٹی کھانے والے بھی ہیں۔ اور وہ لوگ بھی ہیں۔ جن کی لاکھوں روپے کی بچتیں بنکوں میں موجود ہیں۔ معاشی مساوات کے ان ملکوں میں ایسے بھی لوگ ہیں جنکے پاس کوئی سواری نہیں اور وہ پیدل چلنے پر مجبور ہیں اور ان کے پہلو بہ پہلو وہ ہیں جو موٹروں اور کاروں کے مالک ہیں۔

اشتراکیت کا ایک دعویٰ یہ بھی تھا۔ کہ انسانوں کے دو طبقات ہیں، ایک لوٹنے والا سرمایہ دار اور ایک لٹنے والا مزدور۔ اشتراکیت اس ظالمانہ لوٹ کا سدِ باب کرے گی اور لوٹنے والے طبقے کو ختم کر دے گی۔ تاکہ سب انسان برابر ہو جائیں۔ لیکن اس دعویٰ کا بھی وہی حال ہوا جو پہلے دعوؤں کا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ دعویٰ غیر فطری تھا۔ آج پچاس سال کے طویل تجربے کے بعد دونوں طبقات جوں کے توں تمام اشتراکی ممالک میں موجود ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے یہ سرمایہ دار عوام ہی میں سے تھے۔ مگر اب یہ سرمایہ دار تو بالواسطہ ہی غریبوں اور مزدوروں کا استحصال کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اختیارات کے تو براہِ راست مالک نہ ہوتے تھے۔ مگر اشتراکیت کی برکت سے افسروں کا جو جدید سرمایہ دار طبقہ پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک طرف اگر دولت سے مالا مال ہے۔ تو دوسری طرف جابرانہ اختیارات سے بھی مسلح ہے۔ اور اس طرح پہلے سے زیادہ استحصال پر قادر ہے۔ چنانچہ وہاں کا مزدور آج بھی اسی طرح اپنے فیکٹری مینجر کے استحصال کا شکار ہے۔

جس طرح وہ سرمایہ داری کے دور میں تھا۔ سرمایہ داری کے دور میں وہ کم از کم اپنے استحصال پر احتجاج تو کر سکتا تھا۔

اشتراکیت کے سرمایہ دار کے سامنے وہ اس حق سے بھی محروم ہے۔ اپنے حقوق منوانے کے لیے کبھی تنظیم بنانے کو یا ہڑتالیں کرنے کو اشتراکی سرمایہ دار ملک دشمنی سے تعبیر کرتا ہے۔ کوئی مزدور اپنی مرضی سے اپنا پیشہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ ایک کارخانے سے دوسرے کارخانے میں نہیں جا سکتا۔ غرض تمام اشتراکی ممالک میں مزدور اب بھی مزدور ہے۔ مگر پہلے سے زیادہ مجبور اور سرمایہ دار اب بھی سرمایہ دار ہے۔ مگر پہلے سے زیادہ طاقت ور اور با اختیار۔ کیا اسی کا نام معاشی مساوات ہے؟

اشتراکیت کی اس غیر فطری اور ناکام معاشی مساوات کے مقابلے میں اسلام کا اس سلسلہ میں جو نقطۂ نظر ہے اس کو سمجھنے سے پہلے اس بُنیادی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام کا معاشی نظام امیر کے مقابلے میں غریب اس معنی میں تو کسی کو رہنے ہی نہیں دیتا کہ وہ ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو۔ اسلام کی نظر میں بھوکا ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اس کی بھوک دور کی جائے ننگے کا ہر حالت میں یہ حق ہے کہ اسے کپڑا ملے، بیمار زخمی آدمی ہر حالت میں اس کا حقدار ہے کہ اسے علاج کی سہولتیں میسّر ہوں۔ گویا اسلام کے معاشی نظام میں غریب کا تو وجود ہی نہیں۔ ایسا غریب جو بھوکا ننگا اور ضروریات زندگی سے محروم ہو۔ البتہ دولتمند کے مقابلے میں غیر دولت مند کا وجود ممکن ہے۔ مگر ان دونوں کے درمیان بھی اسلام اس قدر تفاوت کا ہرگز روادار نہیں کہ ایک کو آقا اور دوسرے کو غلام بنا دینے کے مترادف ہو۔ اسلامی نظمِ معیشت کا یہی وہ بُنیادی نکتہ ہے کہ جس

کو نہ سمجھنے کی بنا پر اسلام کے معاشی نظام کا صحیح تصور اذہان میں مبہم رہتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی حضرات اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض اس انتہائی اہم نکتہ کی وضاحت کے بعد اب سمجھئے کہ معاشی مساوات کے سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔

اسلام کی نظر میں تمام افراد معاشرہ اس لحاظ سے برابر ہیں کہ انہیں معیشت کے میدان میں ترقی کرنے کے لیے یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ ہر فرد کا یہ حق ہے کہ اسلامی ریاست اس کے لیے ایسا ماحول اور ایسے اسباب مہیّا کرے جن کے ذریعہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنا پیشہ اختیار کر سکے اور جائز حدود کے اندر جتنی چاہے ترقی حاصل کر سکے۔ اسلام معیشت کے میدان میں ایسی صورتِ حال کا ہرگز روادار نہیں۔ جس کے نتیجے میں بعض کو تو آگے بڑھنے کے لیے خصوصی مراعات حاصل ہوں۔ اور بعض کے راستے میں انہیں پیچھے روکنے کے لیے رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں۔ معاشی مساوات کے اس بنیادی اصول کو متعین کر دینے کے بعد اسلام کہتا ہے کہ اس کائنات کا نظام چلانے کے لیے ہر چیز کے اندر اختلافِ مراتب اور تفاوتِ اصول کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ معیشت اور روزی میں بھی مختلف درجات کا ہونا اس کائنات کا نظام درست رکھنے کے لیے انتہائی اہم ہے۔ جہاں اس کائنات کے لیے ایک دولت مند کا وجود ضروری ہے وہاں مقابلتہً ایک غریب کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ دنیا کا نظام اس اختلافِ مراتب پر قائم ہے۔ یہ اختلاف درجات نہ ہو تو دنیا کا نظام قائم نہیں رہ سکتا ارشاد ربانی ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط (الزخرف ۲۱)

(ترجمہ) "دنیوی زندگی میں ان کی روزی ہم نے تقسیم کر رکھی ہے۔ اور ہم نے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے"

اس آیت مبارکہ میں لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ معیشت و رزق کی یہ کمی بیشی اس خالق کائنات کی گوناگوں حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔ اسی تفاوتِ مراتب پر اس کائنات کے نظام کی بنیاد ہے۔ معیشت کا یہ اختلاف فطری اختلاف ہے۔ اس کو باقی رکھنا ہی عین مصلحت ہے۔ اس کو مٹانا نہ ممکن ہے۔ اور نہ مفید۔ اس کے مقابلے میں معیشت کے درمیان ایک فطری اختلاف ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشرہ کا ایک فرد یا چند افراد دولت کے خزانوں پر متصرف و قابض ہو کر دیگر مستحقین کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ غریبوں کو اپنے استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔ خدا اور اس کے بندوں کے حقوق سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ اختلاف اسلام کی نظر میں قطعًا ظالمانہ ہے۔ اس غیر فطری اختلاف کو اسلام شروع سے پیدا ہی نہیں ہونے دیتا کہ مٹانے کی ضرورت پیش آئے۔ اگر کسی معاشرے میں ایسا غیر فطری اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ تو اس کو مٹا دینا ہی اسلام کا عین منشا ہے۔

دراصل ایک چیز ہے انفرادی اور شخصی تمول مگر جائز حدود کے اندر۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اور ایک ہے وہ تمول جو جاگیر اور تعلقہ دار کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جس کا منتہائے مقصود جائز و ناجائز ذرائع سے دولت

جمع کرنا اور اس کو منعم حقیقی کے احکام کے مطابق خرچ کرنے کے بجائے اپنی ہوائے نفسانی اور خواہشاتِ شیطانی کی تسکین کا ذریعہ بنانا ہے۔ اس تمول کا اسلام سختی سے مخالف ہے اور یہی معیشت کا وُہ غیر فطری اختلاف ہے۔ جسے اسلام کسی صورت برداشت نہیں کرتا۔ اسلام اس غیر فطری اختلاف کو دور کرنے کے لیے درج ذیل ذرائع اختیار کرتا ہے۔

(۱) اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرمایہ داری کی تمام خرابیاں ارتکازِ دولت کی بنا ر پر پیدا ہوتی ہیں چنانچہ اسلام اپنی معیشت کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھتا ہے۔ کہ معاشرہ میں ارتکازِ دولت نہ ہونے پائے۔ اور اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر مال کے کمانے میں جائز و ناجائز کی تفریق کرتا ہے۔ جائز ذرائع سے مال کمانے کی آزادی دے کر ناجائز ذرائع قطعاً ممنوع ٹھہراتا ہے۔ اور پھر ان کی سختی سے حفاظت کرتا ہے۔ اس امر سے کون آگاہ نہیں کہ ارتکازِ دولت پیدا ہی ناجائز ذرائع سے ہوتا ہے۔

(۲) ارتکازِ دولت کو روکنے کے لیے دوسری بڑی تدبیر اسلام یہ اختیار کرتا ہے کہ سود کی ہر شکل کو حرام قرار دیتا ہے اور اس طرح سرمایہ داروں کے لیے دولت سمیٹنے کا سب سے بڑا راستہ مسدود کر دیتا ہے۔ دراصل سود ہی سرمایہ داری کی اصل جڑ ہے۔ اسی کے ذریعے سرمایہ دار پوری ملکی معیشت کو اپنی مرضی سے جس راستہ پر چاہے چلا سکتا ہے۔ اس بات سے تو اشتراکیت بھی متفق ہے۔ مگر عملاً کوئی بھی اشتراکی ملک سرمایہ داری کی اصل لعنت کو آج تک ختم نہیں کر سکا۔ اسلام اسے نہایت آسانی سے ختم کر دیتا ہے۔

(۳) وراثت کی تقسیم کے ذریعہ بھی اسلام دولت کے ارتکاز کو ظہور پذیر نہیں ہونے دیتا تھوڑے وقفے کے بعد بڑی بڑی جمع شدہ املاک واموال کو وارثوں میں تقسیم کر کے منتشر کر دیتا ہے۔

(۴) ارتکاز دولت کی بندش کے بعد اسلام اس بات کا خاص اہتمام کرتا ہے کہ معاشرہ میں کوئی شخص محروم نہ رہے۔ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے وہ ایک ایسی سوشل انشورنس سکیم جاری کرتا ہے۔ جو صرف غریبوں کے لیے ہے اور جس کو منظم طور پر بروئے کار لانے کے بعد اسلام معاشرہ میں (Have Nots) یعنی محرومین کا وجود ہی نہیں رہنے دیتا (Havenots) کی کفالت کی تمام ذمہ داری اسلامی ریاست پر ہے۔ یہ اس کا فرض ہے کہ بلا مطالبہ ان کی ضروریات پوری کرے۔

(۵) اجرتوں کا معیار بھی اسلام شخصی کفالت کے اصول پر قائم کرتا ہے اسلام کے نزدیک کسی شخص کی آمدنی اور اجرت اس کے معقول گزارے کی بنیاد پر طے کی جائے گی۔ اگر آمدنی کفالت کے معیار سے کم ہے تو اسلامی ریاست اجرت میں اضافے کے ذریعے یا سرکاری خزانے کی مدد سے آمدنی کو کفالت کے معیار پر لائیگی۔

(۶) اسلام کسی ایسی جاگیرداری اور اجارہ داری کا بھی روادار نہیں جو استحصال کا ذریعہ بن جائے۔ اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ کاشت کار کو اس کی ضرورت کی زمین بلاقیمت فراہم کرے۔ اسی طرح مزدور کو روزگار مہیا کرنا بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ کسی زمیندار کے پاس کوئی ایسی زمین نہیں رہ سکتی جو اُسے زیر کاشت نہ لاسکے۔ اگر تین سال تک کوئی زمین کاشت سے محروم پڑی رہے تو وہ

اس کی ملکیت ہے جو اسے زیر کاشت لے آئے اور آباد کرلے۔

(۷) سرمایہ داری کی بڑی خرابیوں میں سے ایک بڑی خرابی قومی دولت کا ضیاع بھی ہے اسلام اس بات کا خصوصی انتظام کرتا ہے کہ وہ تمام راستے حکماً بند کر دیئے جائیں جن سے ملک کی دولت ضائع ہوتی ہے۔ وہ مال کمانے کے ذرائع کی طرح دولت خرچ کرنے کے طریقوں پر بھی جائز و ناجائز کی حدود متعین کرتا ہے۔ قمار بازی، مے نوشی، عیاشی، بے جا اسراف اور اسی طرح قومی دولت کے ضیاع کے دیگر راستوں کو قانوناً ممنوع ٹھہراتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمدردی، صلہ رحمی، انفرادی فیاضی اور اجتماعی رفاہِ عامہ جیسے جذبات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور اس طرح معیار اخلاق کو بلند کر کے مالداروں کو غریبوں کا مددگار بنا دیتا ہے۔

ان تدابیر کے ذریعہ اسلام معیشت کے تمام غیر فطری اختلافات کا معاشرہ سے کلیتہً صفایا کر دیتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیتا ہے۔ جس میں سارے انسان خدا کے بندے اور بھائی بھائی کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہیں، اور معاشی مساوات کی اصل روح سے ہمکنار ہو کر اجتماعی ترقی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

اب تک کی بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جس طرح اشتراکی حضرات کا یہ دعویٰ کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ سوشلزم اور اسلام کا اجتماعی عدل دو مترادف نظریات ہیں۔ اسی طرح ان کے اس دعویٰ میں بھی کوئی وزن نہیں کہ اشتراکی مساوات اسلامی مساوات کے ہم معنی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے

کہ مذہب اور معیشت کی تفریق کی بنیاد پر اشتراکی حضرات جو یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ ہم اسلام کو بطور مذہب برقرار رکھتے ہوئے سوشلزم کے محض معاشی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ وہ دلائل کی روشنی میں کس حد تک ممکن العمل اور کس درجہ مبنی بر حقیقت ہے۔

کیا اسلام اور سوشلسٹ معاشی نظام کا اتحاد ممکن ہے

جو لوگ اسلام کے ساتھ سوشلسٹ معاشی نظام کی پیوندکاری کی باتیں کرتے ہیں وہ شاید اسلام کو دیگر مذاہب کی طرح محض معتقدات اور عبادات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کی تعلیمات محض چند مبنی بر اخلاق نصائح ہی پر مشتمل نہیں بلکہ اس کے پاس زندگی کے ہر گوشہ کے لیے مکمل ہدایت کا ذخیرہ موجود ہے۔ اسلام جس طرح اخلاقی عمرانی اور سیاسی نظام ہائے زندگی کے لیے ایک مکمل لائحۂ عمل متعین کرتا ہے اسی طرح وہ معاشی نظام زندگی کے لیے بھی ایک مبسوط ضابطہ پیش کرتا ہے۔ اسلام کا دامن معاشی نظام حیات سے خالی نہیں ہے کہ اس کے لیے اشتراکی نظریۂ حیات سے مدد لی جائے۔ اسلام کے ساتھ سوشلسٹ معاشی نظام کے اتحاد کی باتیں کرنا دراصل اسلام کو ایک نامکمل مذہب ثابت کرنا ہے۔ دراصل اشتراکی حضرات اسلام کا یہ حق ہی تسلیم کرنے پر تیار نظر نہیں آتے کہ وہ اخلاقیات اور عبادات کے علاوہ ان کی زندگی کے دیگر گوشوں کے لیے بھی ہدایات دے اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرے۔ وہ اسلام کو کھینچ تان کر ان مذاہب کی صف میں لا کھڑا کرنا چاہتے ہیں جن کے پاس چند مواعظ و نصائح کے سوا کچھ نہیں یا جو صرف چند

رسمی عبادات کا مجموعہ ہیں۔ وہ صرف مذہب اور سیاست ہی کی تفریق کے قائل نہیں بلکہ معیشت کے بارے میں بھی ان کا خیال ہے کہ اس سے مذہب کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کو بطور مذہب برقرار رکھتے ہوئے اشتراکی معاشی نظام کو بروئے کار لانے کی باتیں کرتے ہیں۔ بہر حال قطع نظر اس سے کہ اسلام کے بارے میں اشتراکی حضرات کا یہ نقطۂ نظر کتاب وسنت کی منشا کے عین خلاف ہے اور اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کی بنا پر کسی نہ کسی اضافہ کا محتاج ہے اور نہ کسی قطع و برید کا متحمل ہے۔ ہمیں تو دلائل کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ بالفرض والمحال اسلام کو اگر چند معتقدات اور عبادات کا مجموعہ ہی مان لیا جائے تو سوشلسٹ معاشی نظام کو بروئے کار لانے کے بعد اس کی یہ نامکمل حیثیت بھی باقی رہتی ہے یا نہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ سوشلسٹ معاشی نظام کے عملی پہلو اسلام کے ساتھ اس حد تک متصادم ہوں کہ اسلام معتقدات اور عبادات کی صورت میں بھی زندہ نہ رہ سکے اور عملی میدان میں ایسا تضاد رونما ہو جائے کہ اگر سوشلسٹ نظام کو بروئے کار لانا چاہیں تو اسلام بالکلیہ ہاتھ سے جاتا رہے اور اگر اسلام کو بچانا چاہیں تو معاشی نظام کامیابی کی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

یہ تو ظاہر بات ہے کہ کسی نظام کو بروئے کار لانے کا فائدہ اسی وقت ہے جب کہ اسے کامیابی کی منزل تک بھی پہنچایا جائے اور یہ بات بھی بدیہی ہے کہ کسی نظام کو اس کے بنیادی اصولوں سے بے نیاز رہ کر کامیاب نہیں بنایا جا سکتا چنانچہ سوشلسٹ معاشی نظام کو بروئے کار لانے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے ضروری

ہے کہ اس کو نافذ کرنے کے تمام مراحل اس کے بنیادی اصولوں سے مربوط ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو سوشلسٹ معاشی نظام ناکام ہو جائے گا کیونکہ کوئی بھی ایسی عمارت جو اپنی بنیادوں سے ہٹ کر تعمیر ہوئی ہو کھڑی نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ سوشلسٹ معاشی نظام کے وہ بنیادی اصول کیا ہیں جن کو ملحوظ رکھے بغیر اس نظام کا نفاذ ممکن ہی نہیں۔ نیز ہمیں اگر اسلام کو بطور مذہب برقرار رکھنا ہے تو سوشلسٹ معاشی نظام کے یہ بنیادی اصول کسی درجہ میں بھی اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم تو نہیں کہ دونوں کا اتحاد ممکن ہی نہ رہے۔ اس بات کا لحاظ رہے کہ ہمارے زیرِ بحث اس وقت اشتراکیت کے وہ بنیادی نظریات نہیں ہیں جو خدا اور رسول کی نفی اور آخرت کے انکار پر مبنی ہیں۔ وہ تو واضح طور سے اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم ہیں اور ہمارے ہم وطن اشتراکی حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں۔ لہٰذا وہ نظریات ہماری بحث سے خارج ہیں ہمیں تو اشتراکیت کے ان نظریات کا جائزہ لینا ہے جن کا تعلق محض معاشیات سے ہے، جو اشتراکیت کے معاشی نظام کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے بغیر اشتراکیت کے کامیاب معاشی نظام کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارا موضوع بحث اس وقت اسلام بھی بطور مذہب اسی محدود اور ناقص مفہوم کے ساتھ ہے جو اشتراکی حضرات نے زبردستی اس کے لیے فرض کیا ہوا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہی ہے کہ ایک کامیاب سوشلسٹ معاشی نظام کو بروئے کار لا کر اسلام کے معتقدات اور عبادات ہی کا تحفظ بھی ممکن رہ سکے گا یا نہیں۔

* * *

مرکزیتِ معیشت:

اشتراکیت کے معاشی نظام کی پوری عمارت اس مفروضہ کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے کہ انسانی زندگی میں معیشت کو مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل ہے۔ انسانی زندگی کے کسی گوشہ کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر استوار نہ کر دیا جائے۔ گویا انسانی زندگی کے تمام معاملات کا معیشت کی بنیادوں پر طے کیا جانا ضروری ہے۔ پوری انسانی زندگی اس کی معیشت کے تابع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سوشلسٹ معاشی نظام کے نفاذ کے تمام مراحل میں اس بنیادی اصول کو مدِ نظر رکھنا ہو گا اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں کی اصلاح کا خاکہ ہمیں اصلاح معیشت کے تابع رکھ کر بنانا پڑے گا۔ ہر موقعہ پر اولیت معیشت ہی کو حاصل رہے گی۔ اس اصول کو نظر انداز کر دینے کا مطلب سوشلسٹ معاشی نظام کو مسمار کر دینے کے مترادف ہے۔

اب مرکزیت معیشت کا یہ اصول جس کے بغیر اشتراکی معاشی نظام ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ اسلامی تصورِ حیات کی عین ضد ہے۔ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی میں اوّلین حیثیت انسان کے مقامِ عبودیت کو حاصل ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۔

(الذاریت: ۵۶)

(ترجمہ) میں نے جن وانس کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

گویا انسان کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار کرے۔ ظاہر ہے مقصد تخلیق سے زیادہ انسان کی زندگی میں کسی

مقام کو کیا اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ تعلق جو خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے
انسان کو اپنے رب کے ساتھ ہے انسانی زندگی کے تمام دوائر کے لیے مرکزی نقطہ
کا حکم رکھتا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے جس گوشہ کی بھی اصلاح کے لیے ہدایات
دی ہیں انسان کے اسی مقام کو مدنظر رکھ کر دی ہیں۔ اسلام کی نظر میں انسانی زندگی کی
اصلاح کا انحصار انسان کی معیشت پر نہیں اس کے مقام عبودیت پر ہے۔ گویا انسانی
زندگی کے تمام پہلوؤں کے درمیان، اسلام انسان کے روحانی پہلو کو سب سے زیادہ
اہمیت دیتا ہے اور اس کے تمام معاملات ایسی بنیادوں پر طے کرتا ہے جو کسی
طرح بھی اسکی زندگی کے اس پہلو کو ٹھیس نہ پہنچاتی ہوں۔ عبودیت کی راہ سے ہٹ
کر کوئی بھی راہ اسلام کی نظر میں انسانی فلاح کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ انسان اور خدا کے
درمیان یہ عبودیت و ربوبیت کا تعلق اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔
اسلام کے اگر اس بنیادی عقیدہ کی حفاظت کرنا مقصود ہے تو لازمی طور پر
ہمیں ہر اس عمل سے اجتناب کرنا ہوگا جو انسان کے مقام عبودیت کیخلاف
ہو اور کسی طرح بھی انسان کے آقا رب العالمین کی منشا کے مخالف پڑتا ہو۔ خواہ
ظاہر نظر میں وہ مادی طور پر ہمارے لیے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔ اپنے معاشی
نظام کی اصلاح کرتے وقت بھی ہمیں اسلام کے اس نقطۂ نظر سے سر مو انحراف کی
اجازت نہیں اب ذرا غور فرمایئے ایک طرف سوشلسٹ معاشی نظام کو کامیاب بنانے
کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی زندگی کے تمام معاملات اصلاح معیشت کی بنیادوں
پر طے کریں۔ دوسری طرف اسلام کے بنیادی عقائد کے تحفظ کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی
زندگی کے تمام گوشوں کی اصلاح انسان کے مقام عبودیت کو مدنظر رکھ کر کی جائے

معیشت کو انسانی فلاح کی بنیاد بنلتے ہیں تو انسان کے مقام عبودیت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی اور مقام عبودیت کو اولیت دیتے ہیں۔ تو معیشت کی مرکزیت کو نقصان پہنچتا ہے جس پر اشتراکی معاشی نظام کا انحصار ہے۔ گویا سوشلسٹ معاشی نظام کی کامیابی مطلوب ہے تو اسلام کے ایک بنیادی عقیدہ کو خیر باد کہہ دیجئے اور اگر اسلام محبوب ہے تو سوشلسٹ معاشی نظام کی کامیابی سے ہاتھ دھو لیجئے۔ ہے اس تضاد کا کوئی علاج ؟ ہے کوئی ایسی صورت کہ اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کو بھی کوئی ضرر نہ پہنچے اور سوشلسٹ معاشی نظام بھی کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے ؟ ظاہر ہے اسلام اور سوشلسٹ معاشی نظام کے درمیان یہ ایک ایسا کھلا تضاد ہے جس میں موافقت و مطابقت کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔

بنیادی اصولوں کا معیار

اشتراکیت کا معاشی نظام جدلی عمل اور بقائے اصلح کے اصولوں کی پیداوار ہے۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ (Thesis and Antithesis) کے تصادم کے نتیجے میں یہ نت نئی شکلیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ مثبت و منفی کی کشمکش اور نتیجتاً مصالحتی فارمولے کے اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی معاشرہ میں اشتراکیت کا معاشی نظام جن تصورات پر آج قائم ہے اور جن کے اثرات اس معاشرے کی پوری اجتماعی زندگی میں نفوذ کئے ہوئے ہیں لازم ہے کہ کل ان تصورات کے منافی کچھ نئے تصورات ابھریں اور دونوں کی کشمکش کے نتیجے میں مزید مختلف تصورات جنم لیں اور معاشرہ کی اجتماعی معیشت کو نئے سرے سے ان تصورات کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کے اصولوں

میں ہر وقت تبدیلی کا امکان ہے اور اشتراکی قائدین زمانہ کے تقاضہ کا سہارا لے کر جب چاہیں معاشی نظام کے بنیادی اصولوں میں اپنی من مانی ترمیم و تحریف کر سکتے ہیں۔ معاشی نظام کے جن بنیادی اصولوں کو آج صالح ترین ٹھہرایا جاتا ہے کل انہی کو ناکارہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان اصولوں کی پیروی یا بازیافت کی کوشش اشتراکی لغت میں رجعت پسندی کے نام سے موسوم ہوگی۔ غرض سوشلسٹ معاشی نظام کے تمام، بنیادی اصول اشتراکی قائدین کی گرفت میں ہیں وہ جب تک مناسب سمجھیں ان کو صالح ترین قرار دیکر انہیں اپنی اغراض کا آلۂ کار بنائے رکھیں اور جب چاہیں ناکارہ قرار دے کر ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیں۔

اس کے مقابلے میں اسلام کہتا ہے کہ انسان کا معاشی نظام ہو یا سیاسی، اخلاقی لائحۂ عمل ہو یا عمرانی، زندگی کے ہر گوشے کی اصلاح کے لیے جو بنیادی اصول مقرر کئے گئے ہیں وہ ابدی ہیں۔ زمانہ کے تقاضے کے ساتھ ساتھ جزئیات میں تو تبدیلی کا امکان ہے مگر اصول اپنی جگہ اٹل ہیں اور اپنی ذات میں اس قدر جامع ہیں کہ ان میں کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر زمانہ کے بدلے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی ان میں پوری پوری صلاحیت موجود ہے کیونکہ وہ اصول ایک ایسی ہستی کے وضع کردہ ہیں جو مستقبل سے بھی اسی طرح واقف ہے جس طرح اُسے انسان کے ماضی کا علم ہے۔ اس نے اپنے مقرر کردہ اصولوں میں نہ کسی ترمیم کی کوئی گنجائش چھوڑی نہ کسی اضافہ کا امکان باقی رہنے دیا۔ وہ اصول تمام تر انسانی فلاح پر مبنی ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی کامیابی کے صالح ترین اصول ہیں اور ابد تک صالح ترین رہیں گے۔ ان کے ناکارہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان اصولوں کے وضع کرنیوالے

نے یہ حق بھی کسی کو نہیں دیا کہ ان میں ذرہ بھر بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی کر سکے بلکہ صاف طور سے کہہ دیا کہ ان اصولوں سے ہر مو بھی کوئی انحراف کرنے کی کوشش کرے تو ہرگز اس کی پیروی نہ کرو۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ۔

"خالق کی نافرمانی کی بنیاد پر کسی مخلوق کی اطاعت کی کوئی گنجائش نہیں۔"

غرض اسلام کے پیش کردہ معاشی نظام کے تمام بنیادی اصول ہر قسم کی تبدیلی سے مبرا ہیں جب کہ سوشلسٹ معاشی نظام درست ہی اس وقت رہتا ہے جب اس کے اصول ہر زمانہ میں تبدیل ہوتے رہیں۔

اس مقام پر اسلام اور سوشلسٹ معاشی نظام کے درمیان پھر ایسا تعارض واقع ہو رہا ہے جس میں تطابق کی کوئی صورت نہیں۔ سوشلسٹ معاشی نظام کو کامیاب بنانا ہے تو اس کے اصولوں میں تبدیلی کے عمل کو زمانہ و حالات کے تقاضوں کے مطابق جاری رکھنا ہوگا۔ لیکن اسلام اصولوں میں اس تبدیلی کے حق کو صرف خدا کے لیے خاص کرتا ہے۔ وہ انسان کو اس کا حق ہی نہیں دیتا کہ انسانی فلاح کے مقررہ اصولوں میں وہ اپنی طرف سے کسی موقعہ پر بھی کوئی ترمیم و اضافہ کر سکے۔ سوشلسٹ معاشی نظام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو خدا کے حق میں دست اندازی ہوتی ہے۔ اور اگر اس خدائی حق کا تحفظ کرتے ہیں تو معاشی نظام میں فساد واقع ہوتا ہے۔ لازمی طور پر کوئی ایک سمت اختیار کرنی پڑے گی، یا اسلام کو خیر باد کہنا ہوگا یا سوشلسٹ معاشی نظام کو ترک کرنا پڑے گا۔

اخلاقی اقدار کا معیار

اشتراکیت کے نزدیک اخلاقی اقدار عوامل پیدائش کے تابع ہیں اس لیے عوامل پیدائش کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی اقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اخلاقی قدر اشتراکیت کی نظر میں کسی مستقل قدر و قیمت کی مالک نہیں۔ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ آج کی نیکی کل کی برائی میں تبدیل ہو سکتی ہے اور آج کی برائی کل کی نیکی بن سکتی ہے۔ اشتراکی فائدین ہر اس عمل کو نیکی ٹھہراتے ہیں جو سوشلسٹ معاشی نظام کی کامیابی کے لیے مفید ہو خواہ وہ از قبیلِ مکر و فریب ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ لینن کہتا ہے۔

"اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لیے جنگ کی جائے"

"ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے" V. I. Lenins, *The collected Works*.

غرض اشتراکیت کے نزدیک اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں، سوشلسٹ معاشی نظام کو کامیاب بنانے کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے وہی نیکی ہے۔

اس کے بالمقابل اسلام انسانی زندگی کے تمام معاملات میں اخلاق کی مقررہ اقدار کو اوّلین حیثیت کا حامل قرار دیتا ہے اور اخلاق کی اصطلاح کو اشتراکیت کی طرح مبہم نہیں چھوڑتا بلکہ نیکی اور بدی کی جدا جدا نشاندہی کر کے نیکی اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک نیکی اور بدی مستقل

قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ جو چیز آج نیکی ہے وہ کل بھی نیکی ہے۔ اور قیامت تک نیکی رہے گی۔ یہی حال بدی کا ہے۔ مکر و فریب ہر حال میں مکر و فریب ہے۔ جھوٹ دغا بازی ہر حال میں مذموم ہے۔ کوئی بھی مصلحت خواہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو ان برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ اسلام ایسے کسی نظام کا روادار نہیں جو مکر و فریب، چالبازی اور دغابازی کی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہو۔

اندازہ کیجیے اشتراکیت کے معاشی نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اخلاقی اقدار کا وہ تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اسے سرے ہی کالعدم ٹھہرایا جائے اور ایسے کسی عمل سے کوئی احتراز نہ کیا جائے جو اشتراکی معاشی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں۔ کسی درجہ میں بھی ممدو معاون ثابت ہو سکتا ہو۔ خواہ اسلام کی نظر میں وہ کتنا ہی قبیح کیوں نہ ہو۔ نتیجہ ظاہر ہے یا اشتراکی معاشی نظام کو کامیابی سے چلا لیجیے۔ یا اسلام کی اخلاقی اقدار کو بچا لیجیے۔ دونوں کا اتحاد ناممکن ہے۔

اسلام کو برقرار رکھتے ہوئے سوشلسٹ معاشی نظام کو بروئے کار لانے کا دعویٰ کرنے والے ذرا غور فرمائیں کہ اس معاشی نظام کو کامیابی سے چلانے کیلئے کس طرح منطقی نتیجہ کے طور پر اسلام کے بنیادی عقائد ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں یہ تو اسلام کے معتقدات کا حال تھا۔ اب ذرا عبادات کا حشر بھی دیکھ لیجیے سوشلسٹ معاشی نظام کے بنیادی تصورات صرف معتقدات اسلامی پہ ہی ضرب کاری نہیں لگاتے اسلام کے پیش کردہ عبادات کے نظام کو بھی اپنی حالت پر برقرار نہیں رہنے دیتے۔

ابطالِ شخصی ملکیت اور فریضۂ زکوٰۃ

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سوشلسٹ معاشی نظام کی بنیاد شخصی ملکیت کا ابطال ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ شخصی ملکیت کا ابطال اس نظام کا امتیازی نشان ہے۔ اگر اس نظام سے شخصی ملکیت کے ابطال کا تصور نکال دیا جائے تو اس کے دیگر تمام اصول از خود کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تصور کے بغیر سوشلسٹ معاشی نظام ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر غور کا مقام ہے کہ اس نظام کا یہی بنیادی نظریہ جس کے بغیر اس نظام کی کامیابی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ارکانِ اسلام ہی سے ایک اہم رکن زکوٰۃ پر ایسی کاری ضرب لگاتا ہے کہ زکوٰۃ کے پورے نظام کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی جب کوئی شخص اپنی ضرورت سے زیادہ کسی چیز کا مالک ہی نہ ہو گا۔ تو زکوٰۃ کی نوبت ہی نہ آئے گی اور جب زکوٰۃ نہ رہی تو اس سے متعلقہ مسائل و احکام کی بھی کوئی ضرورت نہ رہی نہ اس کے وجوب وغیر وجوب کا کوئی ذکر نہ اس کے مصارف کے صحیح وغیر صحیح کی کوئی بحث۔ ایک طرح سے وہ تمام آیات قرآنی و احادیث نبوی جو زکوٰۃ کے مسائل و احکام پر مشتمل ہیں۔ عملی طور پر متروک ہو گئیں۔ ابتداءً محض متروک الاستعمال ہی ہوں گی لیکن بالآخر یہ ترکِ استعمال اگر ترکِ تلاوت پر منتج ہو تو کوئی بعید از امکان بات نہیں۔ تحریری طور پر یا حافظہ انسانی میں ان آیات و احادیث کا وجود باقی بھی رہے۔ پھر بھی اس طرح قرآن وحدیث کے ایک معتدبہ حصے کے غیر ضروری قرار پا جانے میں تو کوئی شک ہی نہیں گویا اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک رکن بالکل غیر ضروری ٹھہرا۔ اب اسلام کی بنیاد پانچ ارکان پر نہیں۔ چار

ارکان پر قرار پائی - کیا سوشلسٹ معاشی نظام کے ساتھ ساتھ اسلام کو اسی طرح باقی رکھا جائے گا -

اس سلسلہ میں اشتراکی حضرات ایک اعتراض کیا کرتے ہیں - وہ یہ کہ زکوٰۃ کے نظام کو باقی رکھنے پر اصرار کرنے کا مطلب تو یہ ہے - کہ بھوک، ننگ اور افلاس کو برقرار رکھا جائے - اور بنی نوع انسان کی محتاجی کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے - لیکن اشتراکی حضرات کا یہ اعتراض ان کی کم علمی کی بنیاد پر ہے - ان کو شائد یہ علم ہی نہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے فقراء مساکین پر خرچ کرنا ہی ایک مصرف نہیں ہے فی سبیل اللہ بھی زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے ایک اہم ترین مصرف ہے - فی سبیل اللہ کے بارے میں ائمہ کی اکثریت اس کی قائل ہے - کہ اس سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس اصطلاح کا اطلاق محض قتال فی سبیل اللہ پر ہی نہیں بلکہ ہر اس کوشش پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ اسلام کو بلند کرنے کے لیے کی جائے -

لہٰذا زکوٰۃ کے نظام کو برقرار رکھنے کا مطلب بھوک اور افلاس کو برقرار رکھنا نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ تو ایک مؤثر ذریعہ ہے - بھوک اور افلاس کو مٹانے کا جو زکوٰۃ کے نظام کے پوری طرح بروئے کار آجانے کے بعد چند ہی دن میں ایسی مٹ جاتی ہے کہ زکوٰۃ لینے کا مستحق ڈھونڈے سے نہیں ملتا - مگر افلاس ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زکوٰۃ کی ضرورت نہیں رہی - زکوٰۃ کے دوسرے مصارف بھی تو ہیں خصوصاً کلمۂ حق کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک غالب نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کا کام تو ایک مستقل مصرف ہے جس کے لیے ہر وقت زکوٰۃ کے نظام کی ضرورت باقی رہتی ہے - غرض اس حقیقت سے مفر نہیں کہ زکوٰۃ اسلام کے لازمی بنیادی ارکان میں

سے ایک رکن ہے۔ اسے کسی بھی تقاضے اور کسی بھی مصلحت کی آڑ لے کر کبھی بھی معطل قرار نہیں دیا جا سکتا اور اگر اشتراکی معاشی نظام اسے غیر ضروری ٹھہرانے کا باعث بنتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اسلام کے ایک بنیادی رکن کے انہدام کا باعث بن رہا ہے۔ پھر یہی ایک رکن نہیں شخصی ملکیت کے ابطال کے اصول کے نتیجے میں اسلام کا ایک اور اہم رکن حج بھی زکوٰۃ ہی کی طرح کالعدم ٹھہرتا ہے۔

ابطالِ شخصی ملکیت اور حج و قربانی

حج بھی اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ جب ضرورت سے زائد مال کا کوئی مالک ہی نہ رہا تو یہ نوبت ہی کہاں آئے گی کہ اس کے پاس اتنا مال جمع ہو جس پر اس کیلئے حج کرنا واجب قرار پائے۔ لیجئے اسلام کا ایک اور اہم رکن ہاتھ سے نکل گیا۔ نہ حج واجب رہا نہ اس کے احکام و مسائل کی ضرورت باقی رہی۔ قرآن و حدیث کا ایک اور معتد بہ حصہ متروک ٹھہرا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی زکوٰۃ واجب نہ رہی تو قربانی کے واجب ہونے کا بھی کوئی سوال نہ رہا۔ شعائر دینی میں سے ایک اہم شعار بھی غیر ضروری قرار پایا۔

ابطال شخصی ملکیت اور قانون وراثت

اسی طرح تقسیم وراثت کے تمام احکام کی بھی کوئی ضرورت نہ رہی نہ کسی کے پاس اتنا مال ہوگا کہ اس کی ضرورت سے بچا رہے اور مرتے وقت دنیا میں چھوڑ جائے نہ اس کی تقسیم کے لیے شرعی مسائل جاننے کی ضرورت پیش آئے گی۔ قرآن و حدیث کا ایک اور حصہ متروک قرار دے دیجئے۔ زکوٰۃ کے احکام گئے۔ حج کے مناسک نہ رہے، قربانی کے مسائل ختم ہوئے، وراثت کے قوانین کالعدم ٹھہرے۔ ذرا سوچیے

قرآن کا کتنا حصہ قابلِ عمل باقی رہ گیا۔ اس کے علاوہ ان تمام متذکرہ بالا احکام کے ساتھ اللہ نے جو دینی و دنیوی مصالح وابستہ رکھے تھے ان کو جو نقصان پہنچا اس کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ کیا اسی طرح سوشلسٹ معاشی نظام اسلام کو بطور مذہب برقرار رکھنے کا مدعی ہے؟

طوالت سے پرہیز مدنظر ہے ورنہ شخصی ملکیت کے ابطال کے اثرات تو بہت دور تک پہنچتے ہیں۔ شخصی ملکیت کے ابطال کے بعد قرآن وحدیث میں صدقات و خیرات کا ذکر بھی بے معنی ٹھہرتا ہے۔ حقوق وفرائض کے تعین کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ بخشش وعطا، جود وسخا، صلہ رحمی وہمدردی، غمخواری واعانت، ایسی اصطلاحیں قرار پاتی ہیں۔ جن کے کوئی معنی نہیں مگر قرآن وحدیث ان کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔

ذرا غور کا مقام ہے سوشلسٹ معاشی نظام کے بنیادی اصول شخصی ملکیت کے ابطال سے صرفِ نظر کرتے ہیں تو یہ نظام ایک قدم نہیں چلتا۔ اس اصول کا تحفظ کرتے ہیں تو اسلام کے بنیادی ارکان ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اور قرآن وحدیث کا نصف سے زائد حصہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس دعویٰ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ ہم اسلام کو بطور مذہب برقرار رکھتے ہوئے محض سوشلسٹ معاشی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ یہ دعویٰ محض ایک فریب نہیں تو اور کیا ہے۔

قارئین کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اشتراکیت کے محض معاشی نظام ہی کو بروئے کار لانے پر اسلام صرف معتقدات اور عبادات کی حد تک بھی باقی نہیں رہتا۔ ایک طرف مرکزیت معیشت کے اصول اور جدلی عمل کے تحت معاشی نظام کے ارتقا کے نظریات اگر اسلام کے عقائد کی بنیاد ہلا کر رکھ دیتے ہیں تو دوسری طرف شخصی ملکیت کے ابطال کا

اصول اسلامی عبادات کی بساط الٹ چھوڑتا ہے اور زکوٰۃ و حج جیسے اہم ارکان اسلام کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہنے دیتا۔ زکوٰۃ اور حج پر ہی کیا منحصر ہے اسلام کے دوسرے ارکان نماز اور روزے کا بھی اشتراکیت کے ہاتھوں یہی حشر ہو تو کوئی بعید نہیں۔ وہ لوگ جو انسان کو ایک معاشی حیوان سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے اور جن کی نظر میں انسان کی تمام سعی و کوشش کا اول و آخر مقصود محض معاشی فائدہ ہے ان سے کوئی بعید نہیں اگر وہ نماز میں وقت خرچ کرنے کو اجتماعی معاشی فوائد کا ضیاع تصور کرنے لگیں۔ اور یہ پرچار شروع کر دیں کہ جو وقت نماز میں خرچ کیا جاتا ہے وہ اجتماعی بہبود کے کام میں بہتر طور پر صرف کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح ایک قدم آگے بڑھ کر روزے کو بھی اپنی بنیادوں پر اجتماعی بہبود کے منافی خیال کرنے لگیں کہ اس طرح افراد معاشرہ کی عملی قوت کو ضعف پہنچنے کا امکان ہے۔ اور خدشہ ہے کہ عوامل پیدائش میں سے ایک اہم عامل یعنی محنت (Labour) کی صلاحیت کا روزہ رکھنے سے متاثر ہو۔

غرض اسلام کے بنیادی عقائد ہوں یا عبادات، ان کا تحفظ سوشلسٹ معاشی نظام کو بروئے کار لانے کی صورت میں ممکن ہی نہیں۔ اس لیے اشتراکی حضرات کا یہ دعویٰ سراسر غلط ہے کہ اسلامی سوشلزم کا مطلب اسلام کو بطور مذہب برقرار رکھتے ہوئے اشتراکی معاشی نظام کو بروئے کار لانا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ اسلامی سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا کوئی معقول مفہوم ہے ہی نہیں متذکرہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اور سوشلزم دو متضاد نظریات ہیں۔ ان میں کسی درجہ میں بھی نہ کوئی مشابہت ہے

اور نہ کسی صورت ان کا اتحاد ممکن ہے۔ جس طرح سوشلزم کے نظریات کو اسلام کے اجتماعی عدل اور اسلامی مساوات سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں اسی طرح سوشلسٹ معاشی نظام کی اسلام کے ساتھ پیوند کاری کے لیے بھی کوئی وجہ مناسبت موجود نہیں ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اسلامی سوشلزم بھی دراصل سوشلزم ہی کا ایک نیا روپ ہے۔ یہ وہی معروف نظریہ ہے جسے دنیا کمیونزم کی ابتدائی شکل کی حیثیت سے پہچانتی ہے، جس کی ابتدا خدا اور رسول کی نفی اور آخرت کے انکار سے ہوتی ہے، جس کا ہر قدم مذہب کی بیخ کنی کی راہوں کی طرف جاتا ہے اور جس کا ہر اصول اور ہر طریق عمل براہ راست اسلام کے معتقدات، عبادات، معاملات اور اخلاقیات سے مساوی طور پر متصادم ہے۔ ایسے نظریہ کے کفر ہونے میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بنابریں سوشلزم کو اسلامی کہنا ایسا ہی مضحکہ خیز اور بے معنی ہے جیسے کسی کھلے کفر کو اسلامی کے نام سے موسوم کیا جائے اور پھر یہ گمان کیا جائے کہ اس طرح کفر اسلام بن گیا یا کسی حرام چیز کو محض اسلامی کی صفت سے متصف کر کے حلال سمجھ لیا جائے جس طرح ہندو دھرم، بدھ ازم، عیسائیت اور یہودیت جیسے کفریہ مذاہب محض اسلامی کا لفظ لگا دینے سے اسلام نہیں بن جاتے اور جس طرح چوری، زنا، قتل اور ڈاکہ جیسے حرام اعمال کو اسلامی کہہ دینے سے حلال نہیں ٹھہرایا جا سکتا بالکل اسی طرح کفریہ نظام کو اسلامی سوشلزم کہہ دینے سے اسلام کے معاشی نظام کے مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی محل نظر ہے کہ اہل علم کے نزدیک کسی لفظ کے وہی معنی

متنبر ہوا کرتے ہیں جو اس زبان کے بولنے والوں کے نزدیک معروف ہوں۔ سوشلزم ایک معروف نظریہ ہے۔ اس لفظ کے بولتے ہی ہر شخص کا ذہن اسی جانے پہچانے مستقل نظام کی طرف جاتا ہے جس کے بانی کارل مارکس اور اینجلز تھے اور جو اپنے تمام اصولوں اور اپنی تمام جزئیات کے لحاظ سے ایک مستقل مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب ہماری سمجھ میں اشتراکی قائدین کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آتی کہ لفظ تو وہ سوشلزم کا استعمال کریں اور ہم سے کہیں کہ اس سے اسلام کا معاشی نظام مراد لیا جائے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ محض اصطلاح کی حد تک تو وہ اسلامی سوشلزم کا مطلب اسلامی مساوات یا اسلام کا اجتماعی عدل بیان کرتے ہیں مگر جب تفصیل میں جاتے ہیں تو سارے وہی اصول گنواتے ہیں جو سوشلزم کا طرۂ امتیاز ہیں اور جنکو نہ صرف یہ کہ اسلام سے دور کی نسبت نہیں بلکہ وہ سب کے سب اسلامی اصولوں سے براہِ راست متصادم ہیں۔

کوئی اشتراکی قائدین سے ذرا پوچھے کہ تاریخ کے اعتبار سے اوّلیت کس کو حاصل ہے؟ اسلام کو یا سوشلزم کو؟ ظاہر ہے سوشلزم کی تاریخ پچاس پچپن سال سے زیادہ نہیں مگر اسلام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا وہ دین ہے جس نے آج سے چودہ سو سال پہلے بنی نوع انسان کو نجات کی راہ دکھائی بلکہ حقیقت کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو اسلام کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی خود اس دنیا کی تاریخ ہے۔ یہ وہی دین ہے جس کی ابتدار حضرت آدمؑ سے ہوئی اور جو سلسلہ بہ سلسلہ مختلف انبیار کی طرف منتقل ہوتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ذریعہ تکمیل کو پہنچا۔ اس حقیقت کے پیش نظر اشتراکی قائدین کی یہ منطق ہماری عقل سے بالاتر ہے کہ ایسے کامل و اکمل نظام کے مقابلہ میں جس کو دنیا روزِ اوّل سے جانتی ہے کسی ایک شعبۂ حیات کو

بیان کرنے کے لیے کسی ایسے نظام کی اصطلاحوں کا سہارا لیا جائے جو نظریاتی لحاظ سے ابھی تکمیلی مراحل طے کر رہا ہے اور تاریخ کے لحاظ سے ابھی بچپن کی حدود میں ہے۔ اصولی طور پر تو اپنے آپ کو متعارف کرانے کے لیے سوشلزم کو اسلام کا محتاج ہونا چاہیے تھا نہ کہ اسلام اپنے کسی شعبہ کے تعارف کی خاطر سوشلزم سے اصطلاحیں مستعار لیتا پھرے۔

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کے استعمال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بعض اوقات اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کا حوالہ دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کا استعمال درست ہے تو اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کا استعمال کیوں درست نہیں مگر، اشتراکیوں کا یہ اعتراض یا تو ان کی کم علمی کی بنا پر ہے یا وہ سب کچھ جانتے بوجھتے محض عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لیے اس قسم کا مہمل طرزِ استدلال اختیار کرتے ہیں۔ گو زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ جانتے سب کچھ ہیں مگر اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کو اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کے ساتھ خلط ملط کر کے وہ اپنے اس فریب پر نقاب ڈالنا چاہتے ہیں جو سوشلزم کی راہ ہموار کرنے کی خاطر وہ پاکستان کے سادہ لوح عوام کو عرصۂ دراز سے دے رہے ہیں۔ ایک عام آدمی بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ اگر دو چیزیں ایک حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہوں مگر ان کے بعض اجزا میں اختلاف بھی پایا جاتا ہو تو انہیں ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے ان کے ساتھ کوئی ایسا توصیفی لفظ لگایا جاتا ہے جو ان میں تمیز کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقت و ماہیت کی بھی پوری پوری شرح کر دے۔ لیکن اگر دو چیزیں آپس میں متباین و متخالف ہوں تو چونکہ اپنے تباین و اختلاف کی بنا پر وہ پہلے ہی سے ایک دوسرے سے

ممیز ہیں تو نہ ان میں کسی تمیز کی ضرورت ہوتی ہے نہ کوئی توصیفی لفظ لگا کر انہیں ایک ایک دوسرے کے مماثل بنایا جا سکتا ہے۔ اسلامی اجتماعی عدل اور سوشلزم دو متباین نظریات ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کسی درجہ میں بھی کوئی مشابہت و مماثلت نہیں ہے جیسا کہ دلائل سے واضح ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں اسلامی کا لفظ لگا دینے سے سوشلزم اسلام کے مماثل نہ بن سکے گا۔ اس کے برخلاف اسلام کے شورائی نظام اور جمہوریت میں ایک طرف کافی حد تک مماثلت بھی موجود ہے۔ مگر دوسری طرف اس کے بعض حصے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ مغربی طرز کی لادینی جمہوریت میں حاکمیت اعلیٰ ملک کے عام باشندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ انہی کی رائے سے قانون سازی عمل میں آتی ہے اور انہی کی رائے خوانین میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، لیکن اسلام میں حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک بنیادی قانون اپنے رسول کے واسطے سے دیدیتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک پر فرض ہے کسی کو اس میں کسی تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں۔ اس لحاظ سے اسلام اور جمہوریت دو متباین نظام ہیں مگر جہاں تک ریاست کے نظام کو چلانے کا تعلق ہے یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے بہت زیادہ مماثل ہیں۔ مغربی طرز کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے۔ اسلام کا سیاسی نظام بھی اسی کا متقاضی ہے۔ ریاست کا نظام مغربی جمہوریت میں مشوروں سے چلتا ہے اور اسلامی ریاست بھی جمہور کے مشوروں کی پابند ہوتی ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔ (الشوریٰ ۳۸)

(ترجمہ) اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں۔

چونکہ اسلامی ریاست اور مغربی طرز کی جمہوری ریاست نظامِ حکومت کے نفاذ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ حد تک مماثل ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے ایک کو اسلامی جمہوریت اور دوسری کو مغربی جمہوریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کا وہ فرق واضح نہ ہو سکے گا جو حاکمیت اعلیٰ اور قانون سازی کے سلسلہ میں ان دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرنے کے سلسلہ میں اشتراکی حضرات کی پیش کردہ کوئی ایک توجیہ بھی اس قابل نہیں کہ دلائل کا مقابلہ کر سکے۔ بات وہیں آ کر ختم ہوتی ہے کہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ وہی معروف نظریہ ہے جسے دنیا سوشلزم کے نام سے اور کمیونزم کی ابتدائی شکل کی حیثیت سے پہچانتی ہے۔ وللہ الحمد۔

روحانی ترقی کے تین راستے
تصوف
رہبانیت
جوگ
کیا ان کی منزل ایک ہے؟
اگر نہیں تو پھر تصوف کیا ہے؟
سلسلۂ تصوف کے جہرِ درخشاں
حضرت علی ہجویریؒ معروف داتا گنج بخش نے اپنی بلند پایہ تالیف
کشف المحجوب
میں تصوف پر مفصل روشنی ڈالی ہے
جس کو میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی پاکستان نے
حواشی کیساتھ ترتیب و تہذیب دے کر شگفتہ اردو میں پیش کیا ہے۔
(نظرثانی اور اضافہ شدہ نیا ایڈیشن)
علم تصوف پر ایک عظیم کتاب
آفسٹ کی حسین طباعت پرنئے پیراہن میں
صفحات ۸۷۲ — اعلیٰ ایڈیشن ۵۰-۱۹ روپے
۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ